"ہماری قوم جاہل ہے، آپ اس کی جہالت دور کرنے کے لئے کیوں نہیں اٹھتے"

"آپ نے خود کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے"

"میں تو بد قسمتی سے کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکا"

"پھر آپ یہ کیجئے کہ فوراً کسی تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے لیجئے۔ اگر آپ نے پڑھ لیا تو قوم کا کم سے کم ایک جاہل کم ہو جائے گا"

دو شخصوں کی یہ گفتگو بتاتی ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے کرنے کا کام کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کو تلقین کرنے کے بجائے ہر شخص اپنے کام میں لگ جائے۔ زندہ قوم کی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر شخص "میں کیا کروں" کے سوال پر سوچتا ہے۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد "دوسرے کیا کریں" کے سوال پر بحث کرنے لگیں تو سمجھنا چاہئے کہ قوم مر چکی ہے۔ اس قسم کی حرکت موت کی حرکت ہے نہ کہ زندگی کی حرکت۔

جلد ۱ شمارہ ۴	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے۔ بیرون ہند سے ۲۰ ڈالر۔ فی پرچہ دو روپیہ	فروری ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

اداریہ

اسلامی مرکز، جس کے آرگن کے طور پر الرسالہ جاری کیا گیا ہے، اس کا کوئی بھی تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ اس کا مقصد تمام تر تعمیری اور اصلاحی ہے۔

ہمارا یہ خیال کہ دین کا کام سیاست سے الگ ہو کر کرنا چاہئے، کوئی نیا اور وقتی نہیں ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب، جن کی خصوصی سرپرستی اور نگرانی میں الرسالہ جاری کیا گیا ہے، تقریباً ۲۰ سال سے اس نقطۂ نظر کی وکالت کرتے رہے ہیں جس کا ثبوت موصوف کی مطبوعہ کتابوں اور چھپے ہوئے مضامین میں موجود ہے۔

پچھلے دس برس سے مولانا موصوف ہفت روزہ الجمعیۃ میں اس نقطۂ نظر پر جو کچھ لکھتے رہے ہیں، وہ سارے لوگوں کو معلوم ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم موصوف کی قدیم مطبوعہ تحریروں میں سے ایک تحریر زیر نظر شمارہ میں نقل کی جارہی ہے۔ اس تحریر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سترہ سال پہلے، دین کی سیاسی تعبیر و تشریح کو "فتنہ" قرار دیتے ہوئے، کس طرح اس کے خلاف انتباہ دیا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سیاست کو دین سے خارج سمجھتے ہیں۔ جو چیز زندگی سے خارج نہ ہو، وہ دین سے کس طرح خارج ہو سکتی ہے۔ ہمارا مقصد صرف اس نکتہ پر زور دینا ہے کہ دینی پروگرام کو لازماً سیاسی پروگرام کے ہم معنی نہ ہونا چاہئے۔ اسلام کا مقصد سیاسی نظام قائم کرنا نہیں ہے اور نہ یہ کہ سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو تو اس کے ماننے والے وقت کے حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا کردار ادا کرتے رہیں۔ ہمارا کام لوگوں کو آخرت کے مسائل کی طرف متوجہ کرنا ہے نہ کہ دنیا کے مسائل کی طرف۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ کسی وقت خاص میں جو سیاسی اور اجتماعی حالات ہوں ان سے مسلمان متاثر ہوں، جس طرح دوسرے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ مگر ہمارا رویہ محض ان خارجی اثرات کا نتیجہ نہ ہونا چاہئے بلکہ خود اپنے اسلامی فکر کے تحت بننا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی اثرات کو ہمیں برداشت کرنا ہے تاکہ ہم اپنے اصل مقصد —— پیغام خداوندی کی اشاعت کا کام صحیح طور پر جاری رکھ سکیں۔

قرآن میں تمام عبادات سے زیادہ صبر و استقامت پر زور دیا گیا ہے۔ اس کی حکمت یہی ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی ناخوش گوار صورت پیش آئے تو جوابی ذہن کے تحت نہ اٹھ کھڑے ہو، بلکہ اپنے جذبات پر قابو رکھ کر غور کرو۔ تمہارا منصوبہ ردعمل کی نفسیات کا نتیجہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنی علیحدہ ایجابی فکر کے تحت بننا چاہئے۔

موجودہ حالات میں ہمارا سوچا سمجھا ہوا پروگرام یہ ہے:

۱۔ مسلمانوں کے اندر قرآنی طرز فکر پیدا کرنا، تعلیم اور دوسرے اشاعتی ذرائع سے۔

۲۔ اپنے حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبہ کی مہم ترک کرنا اور تعمیر و استحکام کے طریقہ کو رواج دینا۔

۳۔ غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف، لٹریچر اور دوسرے ذرائع سے۔ ★

(ظفر الاسلام خاں)

سترہ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے "تاریخ سے سبق" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسلامی تحریک کو سیاسی انداز سے نہیں چلایا جا سکتا۔ موجودہ زمانہ میں انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ سماج کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کو کس طرح بدلا جائے اور اس کو کس طرح نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ماحول میں اس طرز فکر کا رواج اسلام کے خادموں کے لئے "فتنہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم نے اس سے بچنے کی کوشش نہ کی تو ہم خدا کے دین کو سیاست بنا کر رکھ دیں گے —— "اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لئے مقدر ہیں۔"

(زندگی رام پور، ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ)

اس کے بعد اگلے سال بدایوں (یوپی) میں مسلمانوں کا ایک بڑا دینی اجتماع ہوا جس میں دوبارہ اظہار خیال کا موقع ملا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے ۱۶ اپریل ۱۹۶۱ء کی نشست میں ایک مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر اسی زمانہ میں "قرآن کا مطلوب انسان" کے عنوان سے رسالہ زندگی رام پور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ یہاں رسالہ مذکور کے قدیم فائل سے نقل کیا جا رہا ہے

اسلامی تحریک آخرت کے سوال کو لے کر اٹھتی ہے نہ کہ سیاست کے سوال کو

الرسالہ فروری ۱۹۷۷

"یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لئے فتنہ میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے —— یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے۔ بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر قرآن سے آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہات کہا گیا ہے (توبہ۔ ۳۰) مضاہات کے معنی عربی زبان میں ہیں: مشاکلۃ الشیٔ بالشیٔ (لسان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیوی مصالح کی بنا پر اجنبی خیالات سے متاثر ہو کر ایک غیر قرآنی بات کو قرآنی بنا کر پیش کیا جائے۔

مضاہاتہ کی یہ خرابی آدمی کے اندر خاموشی کے

اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لئے مقدر ہیں

ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کہ جو بات لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کر سکیں اور دوسرے یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیار فکر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو' وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پہلو بہ پہلو چل سکے۔ یہ طرز اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ وہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بنا دیتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزوی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے

اگر بے جا جسارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ تصوف جو بعض محققین کے نزدیک یونانی لفظ تھیوسوفیا (THEOSOFIA) کی تعریب ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں محض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افکار و اشغال کی پشت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تاثر کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس ہیں۔ اس طرح نبوت کے دو سو سال بعد اسلام کی متصوفانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہو گئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جب کہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچہ کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔ یہ اسی قسم کا ایک نیا فتنہ ہے جس سے ہمارے پیش روؤں کو سابقہ میں پیش آیا تھا۔ وہ اگر تعبیر روحانیت کا فتنہ تھا تو یہ تعبیر مادیت کا فتنہ ہے۔ اب اگر ہم نے اس فتنے کو نہ پہچانا اور اس سے اپنے دین کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تو ہم بھی دین کی تعبیر میں اسی قسم کی غلطی کریں گے جو اس سے پہلے صوفیائے کرام سے ہو چکی ہے، اور پھر قرآن کی ایک نئی تفسیر کر کے قدیم روحانی تصوف کی طرح اسلام کو جدید سیاسی تصوف بنا کر رکھ دیں گے اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لئے مقدر ہیں" ■

وحید الدین خاں

(مطبوعہ ماہنامہ زندگی رام پور۔ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

سب سے ضروری کام یہ ہے

THE INDIAN EXPRESS, WEDNESDAY, DECEMBER 8, 1976

Rich and poor come t
Vinod's aid in big wa

A happy Sri Kanth Bali with his son, Vinod, after he was to
an appeal for the amount he needed for Vinod's treatment h
with instant success.—Express photograph by R. L. Chopr

دسمبر ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے۔ دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپرس نے ایک باتصویر خبر شائع کی جس کا عنوان تھا

کیا ونود کو مرجانا چاہیے۔

تصویر میں کنٹھ بلی نامی سبزی فروش کو اپنے دس سالہ لڑکے ونود کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ ونود دل کا مریض ہے۔ اس کے علاج کے لئے اس کا باپ اپنے وطن انت ناگ (کشمیر) سے دہلی آیا۔ یہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ونود کا مرض سنگین ہے اور اس کے علاج میں دس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ اب غریب کنٹھ بلی پریشان ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ علاج کا یہ بل کہاں سے ادا کرے اور اپنے بچے کی زندگی کس طرح بچائے۔

اس خبر کا چھپنا تھا کہ اخبار کے دفتر میں ہر طرف سے روپے آنا شروع ہو گئے۔ صرف تین دن کے بعد ۹ دسمبر کی اشاعت میں اخبار کو اعلان کرنا پڑا کہ "ونود فنڈ" بند کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس فنڈ میں اب تک ۲۵ ہزار روپے آچکے ہیں جو کہ علاج کے علاوہ باپ اور بیٹے کی دوسری ضرورتوں کے لئے بھی کافی ہیں۔

عجیب بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانہ میں اسلامی مرکز کے آرگن ماہنامہ الرسالہ نے بھی ایک تجربہ کیا۔ انگریزی اخبار کی پکار تھی "ونود کو بچاؤ" الرسالہ نے آواز لگائی کہ "انسانیت کو بچاؤ"۔ انگریزی اخبار نے

کنٹھ بلی اور اس کا لڑکا ونود غم اور مایوسی کے بوجھ سے دبے ہوئے دار السلطنت میں داخل ہوئے تھے۔ مگر اخبار میں شائع شدہ ان کی صرف ایک اپیل پر قوم نے ان کو اتنا زیادہ تعاون دے دیا کہ اب ان کے چہرے پر خوشی اور کامرانی کی شادابی کے سوا اور کچھ نہیں ———

کہ انسانیت کے قافلہ کو آنے والے دن سے آگاہ کیا جائے

ایک بچہ کی چند روزہ دنیوی زندگی کو بچانے کا نعرہ دیا تھا۔ الرسالہ نے بتایا کہ سارے انسانوں کی زندگی خطرہ میں ہے۔ لوگ نہایت تیزی سے آخرت کے دائمی عذاب کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مرنے سے پہلے انھیں پیغمبر خدا کی یہ چیتاونی پہنچا دی جائے :

انتم الیوم فی عمل ولا حساب و ستکونون غداً فی حساب ولا عمل

آج تم کو عمل کا موقع ہے اور تمھارے اوپر حساب نہیں ہے، آنے والی دنیا میں تم کو حساب دینا ہوگا اور عمل کا موقع نہیں ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ لفظی تعریف کے خطوط بھیجنے میں لوگوں نے ہمارے ساتھ بخل نہیں کیا۔ مگر جہاں تک حقیقی تعاون کا سوال ہے، ہر طرف سے ایک ہی خاموش صدا آرہی ہے :

زر می طلبی سخن درین است

حال ہی میں نہرو کے شیدائیوں نے بمبئی میں دس کروڑ روپئے کے خرچ سے ایک عظیم الشان نہرو مرکز قائم کر دیا مگر اسلام کے شیدائیوں میں اسلامی دعوت کا مرکز قائم کرنے کا کوئی حوصلہ نہیں۔

مگر یاد رکھئے، یہ صرف دوسروں کو آگ سے بچانے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ خود اپنے آپ کو بچانے کا معاملہ بھی ہے۔ آخرت کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے اگر ہم نہیں اٹھتے تو ہم نہ صرف اپنے فرض کو چھوڑ رہے ہیں، بلکہ یہ ثبوت بھی دے رہے ہیں کہ ہم کو آنے والے ہولناک دن کا یقین نہیں۔ اس دہرے جرم کے بعد آخر وہ کون سی چیز ہوگی جو اس دن کی پکڑ سے ہم کو بچا سکے جب مالک کائنات کی عدالت قائم ہوگی۔ جب نہ کسی کے لئے دلیل بازی کا موقع ہوگا اور نہ کوئی مادی سہارا کسی کے کام آسکے گا۔ والامر یومئذ للہ

مسلمان خدا کی طرف سے اس ذمہ داری پر مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ تمام اہل عالم کو یہ بتا دیں کہ ان کا رب ان سے حساب لینے والا ہے۔ اس تقرر نے ان کے حال اور مستقبل کو اس کار خاص کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ خدائی پیغام رسانی کی اس خدمت کو انجام دیں۔ اگر وہ اس کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کے نزدیک وہ اپنی قیمت کھو دیں گے۔

اس ذمہ داری کو چھوڑنے کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد خدا ان کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دے گا۔ ان کے اوپر دوسری قومیں غلبہ حاصل کریں گی۔ حتی کہ دوسری بنیادوں پر اٹھائی ہوئی ان کی اسلامی تحریکوں پر بھی رولر چلا دیا جائے گا۔ خود ساختہ خیالات کی بنا پر اگرچہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا رہیں گے۔ مگر حالات کی بے رحم زبان چیخ رہی ہوگی کہ ان کا خدا ان کو چھوڑ چکا ہے۔

اقوام عالم کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دینے کے لئے اگر مسلمان نہیں اٹھتے تو ان کی کوئی قیمت خدا کے نزدیک نہیں ہے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں ——— یہود کی تاریخ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے ———

اسلام کے داعی کے اندر کیا اوصاف ہونے چاہئیں

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود

جامعہ ازہر مصر کے شیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے نومبر ۱۹۷۵ء میں ہندستان کا دورہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ جامعہ ڈابھیل (سورت) بھی گئے۔ یہاں اساتذہ طلبہ اور مقامی لوگوں پر مشتمل ایک اجتماع ہوا جس میں تقریباً دس ہزار لوگوں نے شرکت کی مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اس موقع پر شیخ الازہر نے ۱۱ر نومبر کو جو عربی تقریر کی تھی اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

(بعد حمد و صلوٰۃ) کون سی شرطیں ہیں جن کا پایا جانا داعی کے اندر ضروری ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ داعی بصیرت کے ساتھ دعوت پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قل ھذا سبیلی ادعوا الی اللّٰہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی من المسلمین یعنی داعی کے اندر پہلی چیز جس کا پایا جانا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دعوت کے سلسلے میں اسے پوری بصیرت حاصل ہو اور بلاشبہ بصیرت علم کو بھی متضمن ہے یعنی داعی کو دعوت کے طریقے اور انداز سے بھی واقف ہونا چاہئے، اسے قرآن کا علم ہونا چاہئے اسے حدیث سے واقفیت ہونی چاہئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ اللہ نے فرمایا لا یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔ اطلبوا العلم ولو کان بالصین اور فرمایا طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ۔ معلوم ہوا کہ دعوت کے

"موجودہ زمانہ میں اسلام کے بارے میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے ہیں ان شبہات سے واقفیت اور ان کے جواب سے واقفیت اسلام کے ایک داعی کے لئے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کتابوں میں اس قسم کے شبہات کا کافی و شافی ردّ موجود ہے:

الاسلام یتحدی	وحید الدین خاں
حقائق الاسلام واباطیل الخصوم	عباس محمود العقاد
الاسلام والعصر الحدیث	ڈاکٹر اسماعیل
الوحی المحمدی	رشید رضا مصری"

سلسلے کی پہلی چیز یہ ہے کہ اُسے علم بالقرآن اور علم بالسنت حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا اور آنحضور ؐ نے اس کی شرح فرمائی۔ آپ کی اس شرح کو ہم سنت سے تعبیر کرتے ہیں اور احادیث کی بہترین کتابوں میں سے یہ صحاح ستہ کی کتابیں ہیں جن کے مؤلفین نے بڑی محنت کے بعد ان کو جمع کیا ہے۔

امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے مصنفین محض اللہ کی رضامندی کے لئے تدوین و ترتیب میں لگے رہے۔

بہترین کتابوں میں سے جو ایک مسلمان کی عادت و اخلاق کی پوری شرح کرتی ہے، ریاض الصالحین ہے جو امام نووی کی مصنفہ ہے۔ اس کتاب میں ضعیف اور موضوع حدیثیں نہیں ہیں بلکہ یا تو صحیح حدیثیں ہیں یا حسن جو ایک مسلمان کے عمل کے لئے کافی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح سے قرآن کے شارح اپنے قول سے تھے اسی طرح آپ اس کے شارح اپنی زندگی کے اعتبار سے بھی تھے۔ آپ کا اخلاق قرآن تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کان خلقہ القرآن۔ معلوم ہوا کہ داعی کو یہ ضرورت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بھی واقف ہو اور اس کے لئے اسے سیرت ابن کثیر کا مطالعہ کرنا چاہئے جو سیرت کی بہترین کتاب ہے۔

نیز دعوتی کام کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ احیاء علوم الدین کا مطالعہ کریں۔ امام غزالی نے اپنی اس مبارک کتاب میں ہر ایک چیز کو نہایت جامع طریقے سے بیان کیا ہے جس کی ایک داعی کو ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں فقہ بھی ہے، اخلاق بھی ہے، سلوک بھی ہے قلب اور اعمال کی صفائی کے سلسلہ کی ہدایات بھی ہیں، احیاء العلوم کے بارے میں شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں موضوع اور بے اصل حدیثیں بھی ہیں لیکن امام عراقی کی تخریج کے بعد اب یہ ایسی کتاب ہو گئی ہے کہ اس پر ہر مسلمان کو فخر کرنا چاہئے اور بہت سی وہ حدیثیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں امام زبیدی نے اپنی شرح میں ثابت کیا ہے کہ ان کو ضعیف کہنا درست نہیں ہے بلکہ وہ دوسری سند اور دوسری روایات کے اعتبار سے قوی ہیں اور جن احادیث کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کی کوئی اصل نہیں ہے مرتضیٰ زبیدی جو ایک بڑے محدث ہیں، نے ان کی اصل کو دریافت کر لیا ہے

لیکن موجودہ زمانے میں دعوت کے سلسلے میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے ہیں اس لئے ان شبہوں سے واقفیت اور ان کے جواب سے واقفیت ایک داعی کے لئے ضروری ہے اور اس سلسلہ میں الاسلام یتحدی (علم جدید کا چیلنج، مصنف: وحید الدین خاں) حقائق الاسلام وأباطیل الخصوم مصنفہ عقاد، الاسلام والعصر الحدیث مصنفہ ڈاکٹر اسماعیل، الوحی المحمدی مصنفہ رشید رضا کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ داعی کے لئے موجودہ زمانے میں اسلام پر کئے جانے والے نئے نئے اعتراضات اور اس کے جوابات سے آگاہی ازبس ضروری ہے اور ان کتابوں میں شبہات کا کافی اور شافی طور پر رد ہے

دوسری شرط جو داعی کے لئے ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دعوت دینے والے کے قلب میں صرف اللہ کا خوف ہو وہ کسی سے نہ ڈرے اور بغیر خوف لومۃ لائم فریضۂ دعوت و تبلیغ کو انجام دیتا رہے نیز تیسری شرط جس کا داعی میں پایا جانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ دعوت کا کام حکمت اور موعظت کے ساتھ انجام دے

ماحول کی پوری رعایت رکھے۔ ہر طبقہ کے ساتھ اور ہر فضا میں اس طریقے کو اختیار کرے جو طریقہ کہ دعوت کی کامیابی کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ میں فرمایا ہے۔ حالات اور زمانہ کے اعتبار سے دعوت کا وہ طریقہ اختیار کرے جو انسانی مزاج کے مطابق اور حالات کے موافق ہے حکمت و موعظت کا وہ اسلوب اختیار کرے جو قلب کو داعی کی طرف مائل کرے، احساسات کو ابھارے اور انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کرے۔

فرمایا گیا وجادلھم بالتی ھی احسن۔ نرم خوئی اور نرم گوئی دعوت کی اساسی شرطوں میں سے ہے۔

فرمایا گیا۔ ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولك

آیت مذکورہ میں دوسری بات جو فرمائی گئی وہ عمل صالح ہے اور عمل صالح سے مراد ہر وہ عمل ہے جو اسلامی ہے شریعت اسلامیہ کے مطابق ہے اسلام کے مزاج سے میل کھاتا ہے، اور عمل کی غرض و غایت اللہ کی ذات ہے۔ موضوع اور نیت ہر اعتبار سے اسلام کے مطابق ہے۔ اگر نیت خالص نہ رہی یا عمل سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی اور مقصود رہا تو اس عمل کو نہ اسلامی کہا جائے گا اور نہ اس کا نام عمل صالح رکھا جائے گا۔ اس بات پر موجودہ زمانہ میں تنبیہ حاصل کرنا ضروری ہے کہ جو عمل نیت اور موضوع کے اعتبار اسلامی ہوگا وہی عمل صالح کہلائے گا۔ تیسری اور آخری بات جو اس آیت میں فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وقال اننی من المسلمین ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ان تسلم قلبك یعنی اللہ کے لئے تمھارا دل جھک جائے۔ یہی اسلام ہے۔ جس چیز کا اللہ نے حکم دیا ہے اُسے کرو اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے رک جاؤ یعنی تمھارے اندر عبدیت اور خضوع کی پوری شان نمایاں ہو، یہ ہے اسلام اور اللہ کو واحد جانو۔ سر تمھارا اللہ ہی کے لئے جھکے اور ہر معاملے میں اسی کی اطاعت و انقیاد ہو۔ یہی اسلام کے حقیقی معنی ہیں۔

(الجمعیۃ، ۲۱ نومبر ۱۹۷۶ء)

لطیفہ

گاما پہلوان (۱۹۵۸-۱۸۷۶) کو ۲۰ سال کی عمر میں "رستم ہند" اور اس کے بعد رستم زماں کا خطاب ملا تھا۔ ایک بار جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال صدر تھے۔ گاما بھی جلسہ میں موجود تھے۔ لوگ بول چکے تو آخر میں ڈاکٹر اقبال نے اعلان کر دیا کہ گاما اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

گاما پہلوان کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر انھوں نے جسم کو حرکت دی، ہاتھ ادھر اُدھر ہلایا اور کہا "بھائیو! ورزش کیا کرو"

جب وہ اپنی مختصر تقریر ختم کر کے بیٹھے تو دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ گاما پہلوان کی نہ صرف پیشانی پر قطرات نمایاں تھے بلکہ کرتا بھی بھیگ چکا تھا

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے کہ وہ پرچہ بذریعہ وی، پی طلب نہ فرمائیں۔ بلکہ اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں یہ طرفین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا شش ماہی زرتعاون بیک وقت ادا نہ کر سکیں، وہ ہر مہینہ دو روپے کا ٹکٹ لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ کر دیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں

خط وکتابت کے وقت یا زرتعاون بھیجتے ہوئے اپنا پتہ صاف اور حتی الامکان انگریزی میں تحریر فرمائیں۔

الرسالہ نہ صرف ملک کے مختلف حصوں میں پڑھا جاتا ہے بلکہ ملک کے باہر بھی عرب دنیا اور دوسرے علاقوں میں جاتا ہے۔ تاجر حضرات الرسالہ میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

ابولہب کو یہ بات غیر اہم نظر آئی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت ملی اور خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ لوگوں کے درمیان حقیقت کا اعلان کرو تو آپ صفا کی پہاڑی پر چڑھے، اس زمانہ میں کسی بڑے خطرے کے اعلان کے لئے مکہ میں اسی بلند مقام کو استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ نے پکار کر لوگوں کو جمع کیا۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے ایک مختصر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:

"لوگو آگاہ ہو جاؤ، جس طرح تم سوتے ہو، اسی طرح تم مروگے اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح دوبارہ زندہ کئے جاؤگے۔ اس کے بعد یا ہمیشہ کے لئے جنت ہے یا ہمیشہ کے لئے جہنم"

یہ آخرت کی حقیقت کا اعلان تھا جو دنیا پرست لوگوں کو سنایا جا رہا تھا۔ مگر آپ کے چچا ابولہب کی دنیوی فکر کے لئے یہ پیغامِ آخرت اتنا غیر مانوس ثابت ہوا کہ وہ فوراً مجلس سے اٹھ گیا اور چلا کر کہا:

تبالک سائر الیوم الهذا جمعتنا

تمھارا برا ہو۔ کیا تم نے یہی بات سنانے کے لئے ہم کو جمع کیا تھا۔

دین کو جب دنیوی سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا جائے تو وہ بہت جلد لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔

دین آخرت طلبی کا نام ہے

مہاتما گاندھی بھی سوشلزم کو مانتے تھے، اور کمیونسٹ بھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ گاندھی جی اختیاری سوشلزم کے قائل تھے اور کمیونسٹ جبری سوشلزم کے۔ کمیونسٹوں کا سوشلزم عوام میں پھیل گیا۔ جب کہ گاندھی جی کے سوشلزم کو صرف چند ہی لوگ قبول کر سکے۔ وجہ بالکل سادہ ہے: کمیونسٹوں کا نظریہ عوام کی فکری سطح سے قریب تھا۔ اس کے برعکس گاندھی جی کا نظریہ، نسبتاً زیادہ بہتر ہونے کے باوجود، عوام کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو سماجی مسائل پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتے ہوں۔

یہی صورت حال مذہب کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ کوئی مذہبی تحریک عوام میں مقبول ہو رہی ہو تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ صداقت پر مبنی ہے۔ بالکل ممکن

ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ عوام کی فکری سطح سے قریب ہے۔
رمضان کے مہینے میں ان دکانوں پر زیادہ بھیڑ ہوتی ہے جو
سحری اور افطار کے "لذیذ کھانے" فروخت کرتی ہوں۔
اس کے برعکس جو شخص روزہ کا فلسفہ بیان کر رہا ہو،
اس کے حلقہ میں بہت کم آدمی دکھائی دیں گے۔ کیوں۔
اس لئے کہ لذیذ کھانے کی طلب ہر ایک میں ہوتی ہے۔
جب کہ فلسفیانہ غور و فکر سے لوگوں کے سر میں درد
ہونے لگتا ہے۔

جو مذہب "زردہ اور بریانی" میں ثواب کا راز
بتائے، وہ بہت جلد لوگوں کی حمایت حاصل کرلے گا۔ کیونکہ
مذہب کی یہ قسم عوام کی فکری سطح سے انتہائی قریب ہے۔
اس کو اختیار کرنے کے لئے ان کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ توڑنے
کی ضرورت نہیں۔ جو مذہب کشف و کرامت کی داستانیں
اپنے ساتھ لئے ہوئے ہو، عوام اس کی طرف دوڑ پڑیں گے
کیونکہ عجوبہ پسندی ساری دنیا میں سب سے زیادہ عام انسانی
صفت ہے۔ اسی طرح جو لوگ سیاسی اصطلاحوں میں مذہب
کو بیان کریں یا جلسوں اور نعروں والا مذہب تقسیم کرتے
ہوں وہ بہت آسانی سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیں گے۔
کیوں کہ یہ سب وہی چیزیں ہیں جن سے لوگ پہلے ہی سے
مانوس تھے۔

دین کی اصل آخرت ہے۔ دینی زندگی کا مطلب ہے
ایسی زندگی جس میں ساری توجہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی
کی طرف لگی ہوئی ہو۔ مگر لوگ ہر زمانہ میں دنیا دارانہ مشاغل
کی سطح پر ہوتے ہیں۔ اگر دین کو انکی دنیوی زندگی کے
ضمیمہ کے طور پر پیش کیا جائے تو اس کو قبول کرنے میں انہیں
کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں دین ان کو
ٹھیک اسی سطح پر مل رہا ہوتا ہے جس سطح پر وہ خود پہلے سے
ہیں۔ اس کے برعکس جب دین کو آخرت طلبی کے روپ میں
پیش کیا جائے جو اس کی حقیقی صورت ہے تو وہ لوگوں کی
سمجھ میں نہیں آتا۔ لوگ اس کو اپنی فکری سطح سے ہٹا ہوا
پاتے ہیں، اس لئے اسے رد کر دیتے ہیں۔

قدیم مکہ میں جن لوگوں نے نماز کا مطلب یہ بتایا
کہ بیت اللہ میں جمع ہو کر تالی پیٹیں اور سیٹی بجائیں
(انفال ۔ ۳۵) ان کو عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں
دیر نہیں لگی۔ جنھوں نے خدا پرستی کا کمال یہ بتایا کہ حاجیوں
کو پانی پلایا جائے اور مسجد حرام کی خدمت کی جائے (توبہ ۔ ۹)
ان کو بھی بہت جلد عوام الناس کی تائید حاصل ہوگئی کیونکہ
یہ باتیں ان کی فکری سطح سے قریب تھیں۔ وہ اپنے مقررہ
دنیوی ڈھانچہ کو توڑے بغیر اس مذہب کو اپنی زندگی
میں شامل کر سکتے تھے۔ اسی طرح جن لوگوں نے مذہب کا
خلاصہ یہ بتایا کہ احبار و رہبان (بزرگوں) کا دامن تھام
لو (توبہ ۔ ۳۱) وہ بھی عوام میں خوب مقبول ہوئے۔ کیونکہ
ان کا مذہب لوگوں کی دنیا دارانہ زندگی سے کوئی ٹکراؤ
پیدا نہیں کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے محبوب دنیوی مشاغل
میں مصروف رہتے ہوئے یہ اطمینان کر سکتے تھے کہ انھوں
نے اپنی نجات اور کامیابی کا یقینی انتظام کر لیا ہے۔

مگر مذہب کی دعوت جب پیغمبر اسلام ؐ کی زبان
سے بلند ہوئی تو بالکل مختلف صورت حال پیش آئی۔
یہاں جو مذہب پیش کیا جا رہا تھا، وہ لوگوں کی دنیا
پرستانہ زندگی کے سانچہ میں نہ تھا، بلکہ اس کو توڑ کر
اپنی جگہ بنانا چاہتا تھا۔ آپ کا مذہب مکہ والوں کو آخرت
کی طرف دوڑنے کا تقاضا کر رہا تھا نہ کہ دنیا کی طرف۔
اس لئے بالکل فطری تھا کہ طبیعتیں اس سے ابا کریں، لوگ
اس کا انکار و استہزاء کرنے لگیں۔

انھیں کیا کرنا تھا اور وہ کیا کر رہے ہیں

بیسویں صدی کے آغاز میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یورپ اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود ایک احساس ناکامی سے دوچار ہے۔ اس کو نظر آرہا ہے کہ اس کی سائنس اور ٹکنالوجی نے اس کو مشینیں اور سواریاں تو دیں، مگر اس کو وہ فلسفۂ حیات نہ مل سکا جو اس کو یقین کی دولت عطا کرتا۔ انگریز فلسفی بریڈلے (۱۹۲۴ — ۱۸۴۶) نے موجودہ صدی کے ربع اول میں کہا تھا:

"دنیا کو ایک نئے مذہب (New Religion) کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسا عقیدہ چاہئے جو تمام انسانی مفادات کا تعین کرے اور ضروری تناسب کے ساتھ اس کے جواز کی بنیاد ہو، اور اسی کے ساتھ وہ شعور عطا کرے جس سے انسان اس پر اعتماد کے ساتھ قائم ہو سکے۔"

Essays on Truth and Reality, P.446

اس کے بعد خود مغربی ممالک میں ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ان کے پاس خدا کی جو امانت ہے، وہ یورپ کی اس فکری کمی کو پورا کر سکتی ہے، وہ اس کو لے کر اٹھیں اور اہل عالم تک اس کو پہنچا کر اپنا خدائی فریضہ ادا کریں۔ لارڈ پی۔ ایچ۔ کے۔ لوتھین (۱۹۴۰—۱۸۸۲) چالیس سال پہلے ہندستان آئے تھے اور ۱۹۳۸ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے جلسہ کی صدارت کی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جا کر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔" (خطبہ تقسیم اسناد)

منٹگومری واٹ (— ۱۹۰۹) نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں مسلمانوں کی غیرت کو پکارا۔ پیغمبر اسلام کی سیرت پر اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا:

"دنیا بہت تیزی سے ایک ہوتی جا رہی ہے اور اس ایک دنیا میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اس کے اندر اتحاد اور یکسانیت ہو۔ اس رجحان کی وجہ سے یقیناً وہ دن آئے گا جب کہ یہاں اخلاقی اصولوں کا ایک ایسا نظام ہوگا جو نہ صرف عالمی جواز رکھتا ہوگا بلکہ فی الواقع وہ ساری دنیا میں تسلیم کیا جا چکا ہوگا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ محمدؐ تمام نوع انسانی کے لئے ایک عملی اور اخلاقی نمونہ ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان پر رائے قائم کر سکے۔ اب تک یہ معاملہ دنیا کی بہت کم توجہ اپنی طرف مائل کر سکا ہے۔ مگر اسلام کی قوت کی وجہ سے یہ بالآخر اہمیت حاصل کرے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا محمدؐ کی زندگی اور تعلیمات میں سیکھنے کے قابل کچھ اصول ہیں جو مستقبل کی دنیا کو واحد اخلاقی نظام عطا کر سکیں

دنیا کو ابھی تک اس سوال کا آخری جواب نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے محمد کے بارے میں اپنے دعوے کی تائید میں اب تک جو کچھ کہا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں بس ایک ابتدائی بیان کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت کم غیر مسلم اس سے مطمئن ہو سکے ہیں۔ تاہم یہ موضوع ابھی کھلا ہوا ہے۔ دنیا کا ردعمل محمدؐ کے بارے میں کیا ہوتا ہے۔ یہ کسی حد تک اس پر منحصر ہے کہ آج کے مسلمان اس کے لئے کیا کرتے ہیں۔ انھیں اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ بقیہ دنیا کے سامنے اپنے مقدمہ کو زیادہ بہتر اور مکمل طور پر پیش کریں۔ کیا مسلمان یہ دکھا سکیں گے کہ ایک متحدہ دنیا کی اخلاقیات کے لئے محمدؐ کی زندگی ایک آئیڈیل انسان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے مقدمہ کو بہتر طور پر پیش کر سکیں تو عیسائیوں میں وہ ایسے لوگ پائیں گے جو اس کو سننے کے لئے تیار ہیں۔" (صفحہ ۳۳۴)

Montgomery Watt
Mohammad As Model for Universal Morality

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے۔ مسلمان اس پوری مدت میں مغربی قوموں سے سیاسی لڑائی تو لڑتے رہے جس میں مغرب صریح طور پر ان کے اوپر برتری رکھتا تھا۔ مگر فکری اور اعتقادی میدان، جو مغربی قوموں کا کمزور گوشہ تھا، وہاں ان پر کوئی جدوجہد نہ کی۔ نادانی کی ایسی عجیب و غریب مثال شاید پوری تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

فکری اور نظریاتی طاقت کی اہمیت کیا ہے، اس کی ایک مثال یہاں ہم خود جدید مغربی تاریخ سے پیش کریں گے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران روس میں کمیونسٹوں کا غلبہ برطانیہ عظمیٰ کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ کیونکہ یہ برطانوی سلطنت کے "مشرقی حصہ" کے لئے خطرہ کے ہم معنی تھا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریز فوجی افسروں کا ایک وفد صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے سمرقند پہنچا، اگرچہ بظاہر یہ بتایا گیا تھا کہ یہ ایک تجارتی وفد ہے اور وسط ایشیا کی کپاس کا سودا کرنے جا رہا ہے۔ وفد کے ممبران یہ تھے:

کرنل بیلی (Colonel F.M. Bailey)

کرنل ایتھرٹن (Colonel P.T. Etherton)

میجر بلیکر (Major L.V.S. Blacker)

واپسی کے بعد کرنل ایتھرٹن نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "وسط ایشیا کے قلب میں"

In the Heart of Central Asia

انھوں نے اپنی اس کتاب میں جو باتیں لکھیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

The new set of ideas of the Bolsheviks was potentially much more of a menace to English domination in the orient than all of the Czar's armies in the past.

یعنی بالشویکوں کے نظریات بالقوہ طور پر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات کے لئے اس سے زیادہ بڑا خطرہ ہیں جتنا کہ ماضی میں زار کی تمام فوجیں ہو سکتی تھیں۔ (۹۲-۹۳)

نہرو سنٹر میں پلانیٹیریم کی عمارت

آسمان کا مشاہدہ

پلانیٹیریم میں

ہندستان کی جدید تاریخ پر نہرو خاندان کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کے کسی بھی صفحہ پر اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی کے بغیر جدید ہندستان کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

ہندستان کی تاریخ کے اس پہلو کو واضح کرنے کے لئے جو ادارے ملک میں قائم ہوئے ہیں، ان میں ایک جدید شاندار اضافہ بمبئی کا نہرو سنٹر ہے جو ۳ء۴ ہیکٹیر رقبہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے نومبر ۱۹۷۲ میں اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ ابتداءً اس کا بجٹ ۳ء۵ کروڑ تھا۔ مگر ۱۹۷۸ میں جب وہ آخری طور پر مکمل ہوگا تو اندازہ ہے کہ اس کی لاگت ۱۰ کروڑ روپے تک پہنچ جائے گی۔

نہرو سنٹر میں مختلف قسم کے علمی اور ثقافتی شعبے قائم ہوں گے۔ لائبریری، میوزیم، کلچرہال، آرٹ گیلری، ڈراما اکیڈمی، آڈیٹوریم، ہاسٹل، منی ڈزنی لینڈ، ہابی ورکشاپ وغیرہ۔ نہرو سنٹر کی تمام سرگرمیاں تحقیقی نوعیت رکھنے والی (RESEARCH ORIENTED) ہوں گی۔

بمبئی کے اس نہرو سنٹر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک پلانیٹیریم (planetarium.) بنایا گیا ہے۔ یعنی آسمانی مشاہدہ گھر۔ یہ ایشیا میں اپنی قسم کا سب سے بڑا اور دنیا کے بہترین پلانیٹیریموں میں سے ایک ہے۔ یہ نہرو پلانیٹیریم ۶۵ء۱ کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا ہے۔ اس رقم میں مسٹر کے۔ کے برلا کا عطیہ ایک کروڑ روپیہ ہے۔ پلانیٹیریم کے ایڈوائزری بورڈ میں ملک کے جو نامور سائنس داں شامل ہیں، ان میں مسٹر ایم۔ ایف۔ حسین کا نام بھی ہے۔

یہ پلانیٹیریم نہ صرف عام مشاہدین کے لئے اس بات کا ذریعہ ہوگا کہ وہ ایک ہال کے اندر بیٹھ کر "آسمانی سیر" کر سکیں۔ بلکہ ریسرچ کے طلبہ کے لئے علم افلاک اور خلائی سائنس کے ہر شعبہ کے مطالعہ میں مددگار ثابت ہوگا۔

اس پلانیٹیریم کا ڈزائن اور منصوبہ ہندستانی ماہرین نے تیار کیا تھا، اور وہ ہندستانی فرموں کے علاوہ جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک کے سامان اور ٹکنکل تعاون سے بنایا گیا ہے۔ اس پلانیٹیریم میں بیٹھ کر آپ نہ صرف آج کے آسمان کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ ۲۷ ہزار سال پہلے اور ۲۷ ہزار سال بعد تک کے آسمان کا مشاہدہ بھی منٹوں میں کر سکتے ہیں۔ پلانیٹیریم کے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ یہ ہے کہ نوجوانوں میں علمی نقطۂ نظر (SCIENTIFIC APPROACH) پیدا کرنے کے لئے خصوصی پروگرام رکھے جائیں۔ اس مقصد کے لئے پلانیٹیریم میں مختلف قسم کے سائنسی شو دکھائے جائیں گے جو چھوٹے بچوں سے لے کر یونیورسٹی کے طلبہ تک کے لئے ہوں گے۔ ملک کے مختلف حصوں کے لوگ اس میں شریک ہوں گے۔

بمبئی کی رات کا آسمان منٹوں میں آپ کے لئے قطب جنوبی یا قطب شمالی کا آسمان بن سکتا ہے جہاں ستارے نہ ڈوبتے ہیں نہ نکلتے ہیں۔ یہاں آپ شہابیے، دمدار ستارے، سورج، چاند، شمسی نظام، حتیٰ کہ کہکشاؤں اور سحابیوں کو اس طرح دیکھ سکتے ہیں گویا کہ آپ آسمانی فضا میں شامل ہو کر پوری کائنات کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ایک زمینی سال کو اس گنبد نما "آسمان" میں ۱۰ منٹ میں پورا کر دیا جاتا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے مناظر کو دکھانے کے لئے اس میں جو پروجکٹر لگے ہوئے ہیں ان کی تعداد مجموعی طور پر ۱۱۰ ہے۔

اس قسم کا ایک پلانیٹیریم بنانے کے لئے مختلف علوم درکار ہوتے ہیں مثلاً فلکیات، بصریات، الکٹرانکس، انجینیرنگ وغیرہ —— آسمان کا سائنسی مشاہدہ کرنا ہو تو بہت سے علوم ضروری ہو جاتے ہیں

بٹن

نائلون و پلاسٹک کے بٹن
ہر کوالٹی اور ہر رنگ میں
قمیص، کوٹ، پینٹ، چسٹر
اور کالر، شولڈر پیڈ وغیرہ کیلئے
ہول سیل ریٹ پر طلب فرمائیں۔

دہلی بٹن اسٹور

۱۱۰۵ نواب منزل
کشن گنج آزاد مارکیٹ دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

حقائق کا مقابلہ الفاظ سے نہیں کیا جا سکتا

نواب واجد علی شاہ فروری ۱۸۵۶ تک اودھ کے حکمران تھے۔ ان کو "سلطان عالم" کا خطاب حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ملک کے بیشتر حصوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوگیا اور خبریں آنے لگیں کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی ہیں تو نواب اودھ کی عورتیں محل میں نواب کے گرد جمع ہوئیں اور دشمن کو کوسنا شروع کیا:

"موئے فرنگیوں کی توپوں میں کیڑے پڑیں" نواب اودھ کے محل کا یہ واقعہ بظاہر ایک انوکھا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھئے تو موجودہ زمانے میں ہمارے لیڈروں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

پچھلی صدیوں میں جب مغربی قومیں اسلامی ملکوں پر چھا گئیں تو اس کے مقابلہ کے لئے ساری مسلم دنیا میں بے شمار لیڈر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مشرق کے اوپر مغرب کا یہ غلبہ، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ایک سائنسی واقعہ تھا نہ کہ سادہ معنوں میں محض ایک سیاسی واقعہ۔ مگر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے درمیان جو لوگ اٹھے وہ سب شاعر تھے یا خطیب۔ یہ غالب قومیں سائنس اور ٹکنالوجی کے زور پر آگے بڑھ رہی تھیں۔ مگر ان کو مغلوب کرنے کے لئے ہمارے لیڈروں کے پاس جو چیز تھی، وہ صرف پر شور الفاظ کا طوفان تھا۔ نواب اودھ نے مشین کا مقابلہ اگر عورتوں کے کوسنے سے کرنا چاہا تھا تو لیڈروں نے مشین کا مقابلہ شاعری اور خطابت کے ذریعے کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں چیزوں میں ظاہر کے اعتبار سے تو ضرور فرق ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

مولانا محمد علی (۱۹۳۱-۱۸۷۱) کی تقریر و تحریر کا نقشہ رشید احمد صدیقی نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

"وہ کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کروپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے۔ اور محمد علی کو داد دینے سے پہلے انہیں کو داد دی ہے:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے"

جمال الدین افغانی (۱۸۹۷-۱۸۳۸) کی تقریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ ۱۸۶۸ میں وہ ہندستان آئے تھے اور زیادہ تر حیدرآباد میں مقیم رہے۔ یہاں انھوں نے ہندستانیوں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

یا اهل الهند، وعز الحق وسر العدل، لو کنتم، وانتم مئات الملایین، ذبابا لکان طنینکم یصم آذان بریطانیا العظمی ویجعل فی آذان کبیرهم المستر غلادستون وقرا، ولو کنتم، وانتم مئات الملایین من الیهود قد مسخکم الله فجعل کلا منکم سلحفاة وخضتم البحر واحطتم بجزیرة بریطانیا العظمی لجررتموها الی القعر وعدتم الی هند کم احرارا (۷۰)

اے ہندستان والو، عزت حق اور راز عدل کی قسم، تم جو

سیکڑوں ملین کی تعداد میں ہو، اگر تم مکھیاں ہوتے تو تمہاری بھنبھناہٹ برطانیہ عظمیٰ کے کانوں کو بہرا کر دیتی، اور مسٹر گلیڈسٹون کے کان اس سے سُن ہو جاتے۔ اور اگر تم یہودی ہوتے اور خدا نے تم کو مسخ کر کے تم میں سے ہر ایک کو کچھوا بنا دیا ہوتا اور تم سمندر کو تیر کر جزیرہ برطانیہ پہنچ جاتے تو تمہارے بوجھ سے جزیرہ غرق ہو جاتا اور تم آزاد ہو کر اپنے ملک میں واپس آتے۔

۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کا اعلان کر دیا، اور یہودیوں کی حکومت تسلیم کر لی۔ اسرائیل کو اقوام متحدہ کا ممبر بھی نامزد کر دیا گیا

شیخ حسن البنا (۱۹۴۸ - ۱۹۰۶) اپنی بارعب شخصیت اور پرزور خطابت کی وجہ سے اس وقت مصر کے انتہائی مقبول قائد بن چکے تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اے اہل مصر، کل ہی کی تو بات ہے کہ ہیضہ کی وبا میں مصر کے چالیس ہزار افراد نے دست و قے میں مبتلا ہو کر جان دے دی، اور تم نے اسے برداشت کر لیا۔ اب کیا، تم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے چالیس ہزار آدمی اور بھی، ہمارے محبوب فلسطین کی آزادی کی خاطر خاک و خون میں لوٹ کر شہادت کا درجہ حاصل کر لیں"

اس قسم کے خطیب سارے عالم اسلام میں پیدا ہوئے۔ اس پوری مدت میں کوئی لیڈر ایسا نہ اٹھا جو علمی تجزیہ اور سائنسی ذہن سے مسلح ہو۔ ہر ایک کے پاس بس شعر و خطابت کا طوفان تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ جس طرح عورتوں کے کوسنے سے انگریزی فوجوں کی توپ میں کیڑے نہیں پڑ سکتے تھے۔ شعراء اور خطباء کی لفاظیوں سے ملت کی تعمیر بھی ممکن نہ ہو سکی۔ ڈیڑھ سو سالہ بلند بانگ کوششوں کا انجام اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ☆

ایجنسی کی شرائط

۱۔ کم از کم دس پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۲۔ کمیشن پچیس فی صد

۳۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمّے ہوں گے۔

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جائیں گے۔

منیجر الرسالہ ۱۰۲۶ کشن گنج، دہلی - ۶

ڈاکٹر مسلمہ خانم

اس کا ارادہ
اس کی بیماری پر
غالب آیا

کلاس میں صحت کی بات چھڑ گئی۔ ماسٹر صاحب صحت کے اصول لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک طالب علم کھڑا ہو گیا "ماسٹر صاحب" وہ بولا "اجازت ہو تو ایک بات دریافت کروں۔"

"ضرور"

"ماسٹر صاحب اس عمر میں آپ کی اتنی اچھی صحت ہے، اس کا راز کیا ہے۔"

اس کے بعد ماسٹر صاحب نے اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔ انھوں نے کہا "یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ میں تم سے بھی چھوٹا تھا اس وقت میں کلکتہ میں تھا، میری صحت بہت خراب ہو گئی، میں اتنا دبلا اور کمزور ہو گیا کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا ڈاکٹر بھی میرے علاج سے مایوس ہو گئے۔ ایک روز ڈاکٹر نے کہا "اس کو گھر لے جاؤ۔ اب یہ بچ نہیں سکتا تاکہ یہ مرے تو اپنے ماں باپ کے پاس مرے۔"

"ڈاکٹر کو میری موت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے میرے سامنے ہی یہ بات کہہ دی۔ مجھے ڈاکٹر کی بات سن کر بہت غصہ آیا میں نے اپنے دل میں کہا "مجھے زندہ رہنا ہے" اور میں نے اس کے فوراً بعد زندگی کی جدوجہد شروع کر دی۔

"میں نے سوچا کہ سب سے پہلا کام مجھے یہ کرنا ہے کہ اپنے دماغ سے اس خیال کو نکال دوں کہ میں بیمار ہوں یا مرجانے والا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو مجھے بہر حال جینا ہے۔ اس کے بعد نہ میں کسی ڈاکٹر کے پاس گیا اور نہ کوئی دوا کھائی، البتہ اپنی زندگی کو نہایت منظم کر لیا۔ میں روزانہ صبح کو کھلی ہوا میں ورزش کرتا، روزانہ نہاتا، روزانہ اپنے بدن پر تیل کی مالش کرتا اور دن رات کے سارے اوقات کو ایک نظام کے تحت گذارتا۔

میرا ارادہ میری بیماری پر غالب آیا۔ میں دھیرے دھیرے اچھا ہونے لگا۔ میرے چہرے پر موت کے پیلے پن کے بجائے زندگی کی سرخی دوڑنے لگی۔ اب میں ایک تندرست نوجوان تھا جس کی صحت پر لوگ رشک کرتے تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں بچپن سے جوان ہوا اور جوانی کے بعد اب بڑھاپے کا دور شروع ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر کے اندازہ کے خلاف نہ صرف یہ کہ میں زندہ رہا بلکہ پھر کبھی بیمار نہیں ہوا۔ میں نے طے کیا تھا کہ مجھے زندہ رہنا ہے اور قدرت نے یہ الفاظ صحیح ثابت کر دکھائے۔"

Mushrooms sprouting in a bed of wet paddy straw.

کھمب
کی کاشت
بھیگے ہوئے
پیال
میں —

کھمب ایک مفید زراعت ہے اور پروٹین حاصل کرنے کا قیمتی ذریعہ بھی!

کھمب (MUSHROOM) نہایت مفید غذا ہے، باہر کے ملکوں میں اس کو بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ تاہم ہندوستان میں ابھی زیادہ تر پنجاب کے علاقہ میں اس کو مقبولیت حاصل ہوسکی ہے۔

عوام میں مشہور ہے کہ جہاں کتا پیشاب کرے وہاں کھمب پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی لئے کچھ لوگ اس کو ککرمتا بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کھمب قدرت کا ایک قیمتی نباتاتی عطیہ ہے اس کا کتے کے پیشاب سے کوئی تعلق نہیں۔

کھمب کی اہمیت یہ ہے کہ وہ نباتاتی پروٹین حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے اور سستا بھی۔ وہ گھر کے صحن میں بھی اگایا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ بانس کی ٹوکری میں بھی۔

چند برس پہلے کھمب ایک مہنگی غذا تصور کی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ مقدار میں دستیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ اب پنجاب کے علاقہ میں اس کی پیداوار کافی بڑھ رہی ہے۔ پنجاب ایگریکلچرل یونیورسٹی نے اس سلسلے میں کافی دل چسپی لی ہے اور اس کا مائیکروبیالوجی کا شعبہ کسانوں کو کھمب پیدا کرنے میں خصوصی مدد دے رہا ہے۔

کھمب کی پیداوار حاصل کرنے کے لئے صرف ایک شیڈ اور کچھ معمولی سامان درکار ہوتا ہے جو بآسانی دیہات میں مل جاتا ہے۔ کھمب کی مانگ بیرونی علاقوں میں بھی کافی ہے۔ پٹیالہ کے کسانوں نے کھمب کی پیداوار کے ساتھ کیننگ یونٹ بھی لگائی ہے۔ وہ اپنی پیداوار کو کلکتہ اور مدراس کے بازار میں بھیج کر کافی نفع حاصل کررہے ہیں۔

ہماچل پردیش میں کھمب کے فارم ہیں۔ ہماچل یونیورسٹی کا زرعی شعبہ سولان میں اپنی زمین پر کھمب کی کاشت کر رہا ہے اور اس سلسلے میں قیمتی تحقیقات کی ہیں جو کسانوں کے لئے بہت مفید ہوسکتی ہیں۔ ڈوچی اور چال کے کسان اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ۲۵۰ کسانوں نے کھمب کی کاشت کی تربیت حاصل کی ہے جن میں سے ۶۵ کسانوں نے باقاعدہ

طور پر اس کی کاشت شروع کر دی۔

کھمب بہت نازک پودا ہے۔ وہ بہت جلد خراب ہو جاتا ہے اس لئے اس کی کاشت اسی وقت مفید ہے جب کہ اس کی نکاس کا فوری اور معقول انتظام موجود ہو۔ پنجاب کے شہروں میں اب عام طور پر کھمب کی فروخت ہونے لگی ہے۔ کھمب کی بہت سی قسمیں ہیں۔ فی الحال پنجاب کے کسان دو قسم کے کھمب کی کاشت پسند کرتے ہیں۔ ان کی کاشت اپریل سے اگست تک کی جاتی ہے۔

کھمب کی پیداواری لاگت فی کیلو گرام تقریباً ڈھائی روپے ہے جب کہ بازار میں ایک کیلو کھمب ۱۰ سے ۱۵ روپے تک فروخت ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں مثلاً دہلی میں اس کی قیمت ۳۰ روپے کیلو تک ہے۔

اگر جدید اصولوں کے مطابق پیکنگ کا انتظام ہو تو کھمب کے لئے بیرونی ملکوں میں بھی اچھا مارکٹ مل سکتا ہے۔

جن لوگوں کو کھمب کی کاشت سے دلچسپی ہو انہیں مزید معلومات کے لئے ہماچل یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ حکومت نے خاص اس مقصد کے لئے ایک مستقل ادارہ ہماچل پردیش میں قائم کر رکھا ہے۔

The Mushroom Institute
College of Agriculture
Solan,
Distt: SIRMUR
Himachal Pradesh

کھمب اپنی اصل کے اعتبار سے نباتات ہی کی ایک قسم ہے۔ اس کا رنگ سفید اس لئے ہوتا ہے کہ دیگر پودوں کی طرح اس میں سبز نباتاتی مادہ (کلوروفل) نہیں ہوتا۔ کلوروفل نہ ہونے کی وجہ سے وہ سورج کی شعاعوں کی مدد سے اپنے لئے غذا نہیں تیار کر سکتا۔ وہ مردہ نباتاتی چیزوں سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ اس کا شمار ان پودوں میں ہوتا ہے جو اپنی غذا خود تیار نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی تیار غذا پر گزر کرتے ہیں۔ اس قسم کے پودوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ مردہ نباتاتی مواد کو تحلیل کر کے اس کی کاربن ڈائی آکسائڈ کو نکال دیتے ہیں اور اس طور پر پودوں کے لئے کھاد مہیا کرتے ہیں۔

کھمب (کلاہ باراں) کی تقریباً سات ہزار قسمیں شمار کی گئی ہیں۔ فرانس، امریکہ، یونان اور اٹلی میں لوگ بہت شوق سے اس کو کھاتے ہیں۔ کھمب کی بعض قسمیں زہریلی ہوتی ہیں جو دوا میں کام آتی ہیں۔

کھمب یا کلاہ باراں میں غذائیت کا تناسب کیا ہے، اس کو مندرجہ ذیل نقشہ سے سمجھا جا سکتا ہے:

پانی ۲٫۸۹ فی صد

نائٹروجن کے مرکبات ۰٫۱۳ فی صد

نائٹروجن مرکبات کا تقریباً ۳/۴ حصہ فوراً ہضم ہو کر جزو بدن بن جاتا ہے۔

کاربوہائی ڈریٹ ۳٫۴۴ فی صد

شکر ۰٫۱ فی صد

چربی ۰٫۴۴ فی صد

معدنیات ۳۱٫۳ فی صد

(معدنیات میں زیادہ تر پوٹاشیم اور فاسفورک ترشہ پایا جاتا ہے)

اس تناسب سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیگر تازہ ترکاریوں کی نسبت کلاہ باراں میں غذائیت کس قدر زیادہ ہے۔ صرف پیرس میں سایہ دار مقامات پر ڈیڑھ لاکھ من کھمب پیدا کیا جاتا ہے۔

وہ اپنے وطن سے دور نہ تھا

مولانا محمد فاروق خاں
ایم اے

شہر میں آئے اسے عرصہ ہوگیا تھا۔ وطن کے احباب اور دوستوں کی ایک ایک تصویر اس کے ذہن کے پردے پر دھندلی ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر بھی یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اپنے وطن کو یکسر فراموش کر چکا ہوگا۔ وطن کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ان کا مٹنا آسان نہیں ہوتا۔ کوئی خاص وجہ تھی کہ وہ وطن جانے کے لئے اس طرح بے چین دکھائی نہ دیتا تھا جس طرح بالعموم لوگ وطن کے لئے بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا یا اُسے کوئی ایسی چیز حاصل ہوگئی تھی کہ اضطراب اور پریشانی کے بجائے اس کے چہرے سے ایک خاص طرح کا سکون اور اطمینان جھلکتا تھا۔ کچھ لوگ کہتے کہ وہ بالکل بے حس ہوگیا ہے۔ بعض لوگ اسے بے مروت بتاتے۔ کیونکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اپنے وطن عزیز کو یکسر فراموش کر رکھا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اُسے پاگل اور مجنوں قرار دیتے تھے۔

ایک دن اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکلی جس نے ثابت کر دیا کہ اس کے بارے میں لوگوں کے اندازے غلط ہیں، لوگوں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے وہ بے حس نہ تھا۔ اس کے احساسات تو حد درجہ نازک تھے۔ وہ اتنا حساس تھا کہ اس پر رشک آئے۔ کسی نے اس سے پوچھا تھا: آپ وطن کیوں نہیں جاتے ؟ کیا وطن میں آپ کا کوئی نہیں ؟

اس نے کہا: یہ بات نہیں ہے۔ وطن سے بے نیاز کون ہو سکتا ہے۔ میں بھی اس سے بے نیاز اور بے پروا نہیں ہوں۔ لیکن عام طور پر لوگ اپنے وطن کو پہچاننے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ مجھے وطن کی خبر مل گئی ہے۔ میں نے وطن کو جان لیا ہے۔ وطن میں میرا دل بھی لگتا ہے۔ میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں اور سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے وطن پہنچ گیا۔ اب میں نے اپنے حقیقی وطن کو پہچان لیا ہے۔ جب بھی مجھے وطن کی طرف رُخ کرنا ہوتا ہے، اپنے کو حالت سجدہ میں لے جاتا ہوں۔ کسی وطن میں جو سکون اور راحت مل سکتی ہے وہ سکون مجھے سجدہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔

بات تو اس نے گہری کہی مگر اُسے سمجھنے والے تھوڑے ہیں۔ آدمی کا اصل وطن دور نہیں ہوتا۔ پھر بھی اکثر لوگ بے وطن ہوتے ہیں اور غریب الوطنی کی زندگی گزارتے ہیں۔ جب تک آدمی کی روح بیدار نہ ہو، آدمی کو وہ سجدہ میسر نہیں ہوتا جس کو صحیح معنوں میں سجدہ کہا جا سکے، جو اُسے غریب الوطنی سے نجات دے سکے۔ ایسا شخص غریب الدیار ہی رہے گا۔ اس کے دوست اور احباب اسے غریب الوطن بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ اُسے وطن کی خبر ہونے نہ دیں گے ☆

ترکی میں جو یونانی غیر مسلم آباد ہیں
ان کی معاشی حالت اچھی ہے
مگر یونان میں جو ترک مسلمان ہیں
ان کا حال اس کے برعکس ہے

یونان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ ہے۔ یہ اصلاً ترک ہیں اور زیادہ تر یونان کے شمال مشرقی علاقے میں آباد ہیں۔ یہ علاقہ بحر ابیض کے کنارے واقع ہے۔ اس کا مرکزی مقام کوتیلنی (کوملجنہ) ہے

یونانی مسلمانوں کے مسائل تقریباً وہی ہیں جو دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے ہیں۔ وہ اپنے دین پر پختہ ہیں، تاہم نئی نسل میں اعتقادی کمزوری پیدا ہو رہی ہے اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ان میں ایسے مصلحین نہیں اٹھ رہے ہیں جو اسلام کے جوہر کو سمجھیں اور اس کو مؤثر انداز میں ان کے سامنے پیش کریں۔

یہ مغربی تراقیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ باقی وہ لوگ جو اس سے ۸۰۰ میل دور جزیرہ رودس میں رہتے ہیں، وہ بڑی حد تک اسلام سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ کیونکہ جزیرہ سے ترک اقتدار ختم ہونے کے بعد پچھلے پچاس برس سے ان میں اسلام کا کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ جزیرہ رودس میں اب بھی پانچ مسجدیں ہیں جو عثمانی دور کی یاد دلاتی ہیں۔ مگر یہ مسجدیں اس طرح ویران پڑی ہوئی ہیں گویا ان کو عبادتِ الٰہی کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔

شہر کوملجنہ میں چھوٹی مساجد کے علاوہ پندرہ بڑی مسجدیں ہیں۔ یہاں ہر مسجد میں پنج وقتہ نمازیں ہوتی ہیں۔ تراقیا کی ہر ولایت میں ایک مفتی ہوتا ہے جو نکاح، طلاق، میراث، معاملاتِ شرعی اور مساجد و مدارس کے انتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

تراقیا میں تین مسلم جماعتیں ہیں۔ ان میں بڑی جماعت اتحاد مسلمی الیونان ہے جو ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی شیخ مصطفیٰ صبری آفندی تھے جو عثمانی خلیفہ سلطان وحید الدین کے زمانہ میں شیخ الاسلام تھے۔ اس کے ممبروں کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔

اس جمعیۃ نے یونانی مسلمانوں کی مختلف خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً جنگ اول اور ثانی کے زمانہ میں سیکڑوں اسلامی اوقاف (دکان، مکانات، باغات وغیرہ) حکومت یا افراد کے قبضہ میں چلے گئے تھے۔ ان کو دوبارہ حاصل کیا۔ ترکی زبان میں اسلامی کتابوں کی

اشاعت بھی یہی ادارہ کرتا ہے۔ جمعیۃ اتحاد مسلمی الیونان ایک پندرہ روزہ جریدہ نکالتا ہے جس کا نام المحافظون ہے۔ یہ دنیا کا واحد ترکی جریدہ ہے جو عربی رسم الخط میں شائع ہوتا ہے۔

ترک نوجوانوں کی انجمن (تورک گنجلر برلگی) وسائل ذرائع کے اعتبار سے یونانی مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ مگر اس پر اسلامیت سے زیادہ قومیت غالب ہے۔

یونان کے مسلمان، وہاں کے دستور کے مطابق، یونانی پارلیمنٹ کے لئے اپنے تین نمائندے منتخب کرتے ہیں جو حکومت کے سامنے مسلم مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ یہ انتخاب ہر چار سال کے بعد ہوتا ہے۔

مغربی تراقیا میں ۲۰۰ سے زیادہ اسلامی مدرسے ہیں جن میں مسلمان طلبہ عصری علوم کے ساتھ اسلامی علوم پڑھتے ہیں۔ ان میں اساتذہ زیادہ تر مسلمان ہیں یہاں سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لئے یہ طلبہ یونان اور ترکی اور دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ جو یونانی غیر مسلم ترکی میں رہتے ہیں ان کے مقابلہ میں یونان میں رہنے والے مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہت خراب ہے۔ یونانی مسلمانوں کی اکثریت یا زراعت پیشہ ہے یا حیوانات کی پرورش سے گزر اوقات کرتی ہے۔ تجارت اور صنعت میں ان کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ■

البلاغ (کویت) ۲۲ ستمبر ۱۹۷۱

نبذة عن حياة المقيم :
جهاد حافظ رشاد — هو ابن حافظ علي رشاد رئيس اتحادمسلمي اليونان من المجاهدين الكبار من تركيا الذي حكم عليه بالاعدام غيابيا في ثورة مصطفى كمال اتاتورك ضد الخلافة العثمانية . وهو — الان — عضو عامل في مجلس الادارة بالجمعية — اتحاد اسلام — ومدير الادارة بجريدة محافظة كار : ناطق الحال للجمعية المذكورة وهو ايضا يدرس في السنة الاخيرة بكلية الدعوة واصول الدين بالجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة . وله تراجم كثيرة من اللغة العربية الى التركية ومن بين الكتب التي ترجمها : مجموعة الرسائل للامام الشهيد حسن البنا . الاسلام يتحدى . الطريق الى الله والظاهرة القرآنية . ويمارس ترجمة كتب فكرية اسلامية اخرى .

عنوان الجمعية :
اتحاد اسلام — جمعية اتحاد مسلمي اليونان — شارع انيكونو رقم ٢٥ — كوموتيني — اليونان .
عنوان بالمملكة العربية السعودية
جهاد حافظ رشاد
ص.ب ٦٩٧ — المدينة المنورة
المملكة العربية السعودية

الرسالہ اگر آپ کو پسند ہے

تو آپ پر اس کا پہلا حق ہے کہ

آپ فوراً اپنا زرِ تعاون بھیج کر

اس کے معاونین کی برادری میں باقاعدہ شامل ہوجائیں۔

لمثل هذا فليعمل العاملون

في مطلع رمضان .. شهر القرآن .. (١٣٩٣هـ) .. جاءت الأنباء باعلان الرئيس « برنارد بونجو » رئيس جمهورية الجابون ، اعتناقه للاسلام لأنه رأى فيه ، كما جاء في بيانه : نور الفطرة وجلال العدالة والمساواة ..

أما الاسلام .. فان دعاته في افريقيا عشرات .. وفي بعض الأقطار أفراد يعدون على الأصابع .. !!

ومع هذا يعرف الاسلام طريقه الى القلوب .. ولا يخفى نوره على الناظرين ، مهما تكاثرت السحب ، واغبرت الآفاق !!

عجب الناس من اسلام رئيس جمهورية افريقية .. طائعاً مختاراً مستجيباً لله ورسوله لا تحركه رغبة ، ولا تحمله رهبة ..

ولكن العجب ما يلبث أن يتبدد حين يتأمل الانسان حقيقة الاسلام ويعرف خاصته ، التي ترهب أعداءه..!

انه الدين الذي يخاطب الفطرة .. وينادي العقل .. ويحرك الشعور ..

انه الدين الذي لا طلاسم فيه ولا مجاهيل .. ولا خرافات ولا أباطيل .. فاذا ما انزاحت الغشاوة عن البصيرة .. وانجابت سحب الزيف عن الفطرة ، فانها تعرف طريقها الى الاسلام وشيكا .. وتسرع اليه راغبة مشتاقة .. وتنزع الى رحابه راضية مطمئنة ..

انها صورة فريدة من الاستجابة لم تتبدل في كل جيل وقبيل .. منذ عهد النبوة .. حين كان الناس ينقلبون من النقيض الى النقيض .. بتأثير آية يسمعونها .. وحكمة يتلقونها .. فيصبحون آخر النهار من جند الاسلام .. بعد أن كانوا في أوله من أعدائه الألداء ..!!

هكذا فعل الاسلام في حمزة .. وعمر .. وأسيد بن حضير .. وخالد بن الوليد .. وعمرو بن العاص.. وغيرهم من الأبطال الذين كسبهم الاسلام جنودا أوفياء .. بل كسبتهم الانسانية مضحين شرفاء .. ممن تفتحت بصائرهم على نور الاسلام في ومضة خاطفة ، بعد أن كانوا عنه متباعدين ..

بل هي المعجزة الاسلامية التي جعلت التتار يعتنقون الاسلام ويدافعون عنه ، بعد أن أقبلوا من قبل يدمرون حاضرة الخلافة ، ويحاولون هدم حضارة الاسلام !!

بل هذه الحضارة الغربية .. رغم أضوائها وزخارفها لم تستطع أن تحول بين أفراد أنقياء ينتمون اليها.. وبين الاستضاءة بنور الاسلام والاستظلال بظلاله ..

ففي كل يوم يكسب الاسلام أنصاراً في هذه العواصم الحضارية في أوربا وأمريكا .. لا يحجب عنهم ضياء الاسلام ، ما يرونه من ضعف المسلمين وتغلب الأعداء عليهم .. لأنهم يعلمون أن حقائق الاسلام شيء .. وواقع المسلمين شيء آخر ..

تلك خاصة الاسلام في ذاته .. انه دين زاحف منتشر .. يحمل في طبيعته خصائص القوة والوضوح والتأثير في القلوب .. متى برئت من العلل والأهواء ..

ان الحق تبارك وتعالى قد وعد باظهار الآيات التي تؤكد دائما أن الاسلام حق .. وأنه وحي من السماء لا هوى من الأرض .. : (سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق ، أو لم يكف بربك أنه على كل شيء شهيد) ..

وان انتصار الاسلام .. عقيدة مؤثرة ، ودينا يستحوذ على القلوب .. لآية من آيات الله في هذا العصر ، الذي تتداعى فيه الأمم على أمة الاسلام ، والذي تشتد فيه الحرب الخبيثة لانتقاص ديار الاسلام واذلال أتباعه..

في وسط هذا الظلام تأتي أضواء البشائر .. فنرى العقيدة الاسلامية تعرف طريقها الى القلوب .. نقية صافية .. قوية شامخة .. تؤكد أن الاسلام حقاً هو دين الانسانية ، الذي يحقق لها الأمن والطمأنينة ويأخذ بأيديها الى حمى الخير والسلام ..

ولكن هذه القوة الذاتية للاسلام ، لا تعفي الأمة الاسلامية من واجبها في الدعوة اليه ، وفي جلاء الحقائق أمام الانسانية ، حتى تختار طريقها وتعرف سبيلها ..

ان أسلافنا الأماجد قد قاموا بواجبهم خير قيام .. في الدعوة الى الاسلام .. فسعدوا به وأسعدوا الانسانية .. وبقي علينا أن ندرك المسئولية التي يلقيها علينا ديننا الحنيف حتى نكون أهلا لهذا التكريم الذي لقيه الجيل المثالي من هذه الأمة .. جيل الصحابة الكرام الذين نجد وصفهم في قول الحق سبحانه :

(كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله) ..

ولمثل هذا فليعمل العاملون ..

الرسالة فبراير ١٩٧٤

کام کرنے والوں کو

اس کے لئے کام کرنا چاہیئے

رمضان ۱۳۹۳ھ کے آغاز میں یہ خبر آئی تھی کہ جمہوریہ گابون کے صدر برنارڈ بانگو نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ میں نے اسلام کو اس لئے اختیار کیا کہ اس میں مجھے فطرت کا نور اور انصاف اور مساوات کی عظمت نظر آئی۔

اسلام کے مبلغین افریقہ میں دس بیس ہوں گے۔ اور بعض علاقوں میں تو ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود اسلام دلوں تک پہنچنے کے لئے اپنا راستہ پا رہا ہے۔ اس کی روشنی دیکھنے والوں کے لئے مخفی نہیں۔ کیونکہ اسلام وہ دین ہے جو فطرت کو مخاطب کرتا ہے، جو عقل کو پکارتا ہے اور شعور کو حرکت میں لاتا ہے۔ یہ ایسا دین ہے جس میں طلسماتی چیزیں اور مجہول باتیں نہیں۔ اس میں خرافات اور اباطیل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بصیرت سے پردہ اٹھتا ہے اور فطرت کے اوپر سے مصنوعی بادل چھٹتے ہیں تو بہت جلد انسان اسلام کا راستہ پہچان لیتا ہے۔

اسلام کا یہی معجزہ ہے جس نے تاتاریوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا اور وہ اس کی حمایت کرنے والے بن گئے۔ حالاں کہ وہ دارالخلافہ کو برباد کرنے آئے تھے اور اسلامی تہذیب کو مٹا ڈالنا چاہتے تھے۔

موجودہ مغربی تہذیب اپنی تمام چمک دمک کے باوجود اپنے اندر کے صاف ذہن لوگوں کو اس سے نہ روک سکی کہ وہ اسلام کے نور سے اپنے لئے روشنی حاصل کریں۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے تہذیبی مراکز سے اسلام ہر دن اپنے اعوان و انصار پا رہا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کمزور ہیں اور دشمنوں نے ان کے اوپر غلبہ حاصل کر رکھا ہے۔ مگر یہ واقعہ ان کے لئے اسلام کی طرف آنے میں رکاوٹ نہ بن سکا۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کی سچائی الگ چیز ہے اور مسلمانوں کی عملی حالت دوسری چیز۔

اسلام کا ایک مؤثر عقیدہ کی حیثیت سے زندہ رہنا اور اس کا ایسا دین ہونا جو دلوں کو مفتوح کرے، یہ موجودہ زمانہ میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جب کہ قومیں اس کی دشمن بنی ہوئی ہیں اور بلادِ اسلام کو ڈھاتے اور اہل اسلام کو ذلیل کرنے کے لئے جنگیں برپا کئے رہتی ہیں۔

مگر اسلام کی یہ ذاتی قوت امت اسلامیہ کے لئے اس کی دعوتی ذمہ داریوں سے معافی کا سبب نہیں بن سکتی۔ ہم کو بہر حال انسانیت کے سامنے حق کو واضح کرنا ہے تاکہ وہ اپنے طریقے کو پکڑے اور اپنے راستہ کو پالے۔

ہمارے بزرگ اکابر اپنے فرائض کی ادائگی کے لئے پوری طرح اٹھے انھوں نے دنیا کو اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے خود اس سے برکت حاصل کی اور دوسروں کو برکت دی۔ اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم اس ذمہ داری کو سمجھیں جو دین حق نے ہمارے اوپر ڈالی ہے تاکہ ہم اس عزت کے مستحق بنیں جو اس امت کے مثالی لوگوں — صحابہ کرام — کو ملی۔

یہ ہے وہ کام جو کرنے والوں کو کرنا چاہیئے۔

تین سال کے اندر دو عیسائی حکمرانوں کا قبول اسلام

کئی سو سال کے وقفہ کے بعد اسلام دوبارہ اپنی اس تاریخی قوت کو دہرا رہا ہے کہ ملکوں کے حکمراں خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ الرسالہ کے پچھلے شمارہ میں سنٹرل افریقہ کے صدر بوکاسا کے قبول اسلام (اکتوبر ۱۹۷۶) کا واقعہ شائع ہو چکا ہے۔ تاہم اس نئے تاریخ ساز عمل کا آغاز جس نے کیا وہ جمہوریہ گابون کے صدر البرٹ برنارڈ بونگو ہیں جنھوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۳ کو اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا اسلامی نام عمر بونگو رکھا۔ گابون، جنوبی افریقہ کا ساحلی ملک ہے جو اٹلانٹک کے کنارے واقع ہے۔

صدر عمر بونگو کے قبول اسلام کے بعد ان کے خاندان کے تمام افراد مسلمان ہو گئے۔ اس کے علاوہ کابینہ کے اکثر وزراء، حکمراں پارٹی کے ارکان، ملک کی ممتاز شخصیتیں اور عام باشندوں میں ہزاروں لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور برابر ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلم ممالک سے گابون کے نہایت قریبی تعلقات قائم ہیں۔ صدر عمر بونگو نے کہا :

"براعظم افریقہ میں اسلام کا مستقبل روشن ہے"

صدر عمر بونگو، ۳۰ دسمبر ۱۹۳۵ کو فرانس ویل (گابون) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سرکاری ملازمت پر رہے۔ ۱۹۶۰ میں گابون کو فرانس سے آزادی ملی تو وہ وزارت خارجہ کے ایک افسر تھے۔ ۱۹۶۴ میں وہ وزارت میں داخل ہوئے اور مختلف ترقیاں کرتے ہوئے دسمبر ۱۹۶۷ میں جمہوریہ گابون کے صدر منتخب ہوئے۔

جمہوریہ گابون کے صدر عمر بونگو

صدر عمر بونگو کے قبول اسلام کی تقریب میں گابون کی راجدھانی لیبرویل میں ایک خصوصی جلسہ کیا گیا تھا جس میں سعودی عرب، لیبیا، خلیج عرب کی ریاستوں کے وفاق کے وفود نے شرکت کی۔ لیبیا سے آنے والے وفد کے سربراہ شیخ محمود صبحی نے صدر بونگو کو کلمہ شہادت پڑھایا۔ انھوں نے اپنی فرانسیسی تقریر میں کہا:

"میں ایک کیتھولک عیسائی تھا۔ میں نے انجیلوں کا مطالعہ کیا ہے، اور مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تمام ادیان انسانی فطرت سے دور ہیں۔ میں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو میں نے پایا کہ یہی وہ دین ہے جو انسان کو عزت بخشتا ہے اور مختلف انسانوں کے درمیان تفریق نہیں برتتا، وہ انسانیت کا احترام سکھاتا ہے"

صدر عمر بونگو نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ملک کی تعمیر کے لئے ہمارے یہاں تجربہ کار افراد اور ماہرین کی بہت

PRESIDENT OMAR BONGO
BOITE POSTALE 546
LIBERVILLE
REPUBLIC OF GABON

ملی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب صدر بونگو ہندستان آئے تھے تو یہاں انھوں نے بعض مجالس میں ذکر کیا کہ ان کو ایک لیڈی ٹیچر کی ضرورت ہے جو ان کے گھر کی خواتین کو اسلامی تعلیم دے اور ان کی دینی تربیت کر سکے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان ایک مذہبی ملک ہے اور یہاں کوئی خاتون اس کام کے لئے مل سکیں تو میں ان کو ترجیح دوں گا۔ مگر ان کے گھر کی زبان فرانسیسی ہے۔ ان کو ایسی خاتون کی ضرورت تھی جو عربی اور فرانسیسی جانتی ہو۔ مگر ہندستان سے ایسی کسی خاتون کا انتظام نہ ہو سکا۔

گابون کا رقبہ ۲ لاکھ ۶۷ ہزار مربع کیلو میٹر ہے۔ آبادی ایک ملین ہے۔ صدر عمر بونگو کے قبول اسلام سے پہلے یہاں مسلمانوں کی مجموعی آبادی تقریباً ۳۵ ہزار تھی۔ اب اس تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔

گابون اپنے گھنے جنگلات کے لئے بہت مشہور ہے ملک کی اہم پیداوار لکڑی ہے۔ سمندر اور خشکی سے پٹرول بھی نکالا جاتا ہے۔ تیل صاف کرنے کا کارخانہ پورٹ جینٹی میں قائم کیا گیا ہے۔ مگر اس کارخانہ میں حکومت کا سرمایہ صرف ۵ فی صد ہے۔ بقیہ سرمایہ دوسروں کا ہے۔

گابون کو اگست ۱۹۶۰ میں فرانسیسی اقتدار سے آزادی مل گئی تھی۔ مگر اقتصادی آزادی حاصل کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ حکومت کے عہدوں پر زیادہ تر فرانس کے تعلیم یافتہ عیسائی قابض ہیں۔ ملک کا سارا نظم بھی چلاتے ہیں۔ عیسائی مشنریاں بھی کثیر تعداد میں ملک کے اندر پھیلی ہوئی ہیں اور منصوبہ کے تحت منظم طور پر اپنے تبلیغی مشن میں مصروف ہیں۔ اسپتال، اسکول، کالج، کھیل کے میدان، کلب، غرض جدید زندگی کی سرگرمیوں کے تمام ادارے انھوں نے قائم کر رکھے ہیں اور ان کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔

صدر عمر بونگو نے ملک کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے ایک جامع منصوبہ بنایا ہے اور اس سلسلہ میں عرب حکومتوں سے تعاون کی درخواست کی ہے۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ عرب ممالک زیادہ سے زیادہ انھیں پٹرو ڈالر دے سکتے ہیں جب کہ گابون کو اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے وہ "انسان" ہیں نہ کہ ڈالر۔ اس کو ہر فن کے ایسے ماہرین درکار ہیں جو ملک کے ترقی پذیر معاشرہ کے مختلف شعبوں کا چارج لے سکیں۔ اور اس معاملہ میں عرب ممالک کا حال یہ ہے: ؎ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

گابون، اسی قسم کے دوسرے افریقی ممالک کی طرح، ایک نئے تاریخی موڑ پر کھڑا ہے۔ زراعتی شعبے، تجارتی منصوبے، صنعتی تنظیمیں، تعلیمی درس گاہیں، سائنسی تحقیقات اور حکومتی دفاتر سے لے کر خالص مذہبی اداروں تک ہر کام کے لئے اس کو تربیت یافتہ کارکنوں کی ضرورت ہے۔ کچھ افراد، اپنی فطرت کی آواز پر، دین حق میں شامل ہو گئے ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ ملک کے حکمراں افراد ہیں اور اگرچہ ملک کے تقریباً تمام شعبوں پر عیسائیوں اور فرانسیسیوں کا قبضہ ہے، یہ نو مسلم حکمراں مسلمانوں کو موقع دے رہے ہیں کہ وہ یہاں آئیں اور ہمہ گیر جدوجہد کے ذریعے ملک کے مستقبل کو بدل ڈالیں۔ مگر مسلم ممالک کے رہنماؤں اور مفکروں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ یہ ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی فکر میں لگے رہیں۔ اور اگر عملاً اس کے مواقع نہ ہوں تو "قنوت نازلہ" پڑھنا شروع کر دیں۔ وقت آگیا ہے کہ سطح ارض پر اسلام کی تاریخ دوبارہ لکھی جائے۔ مگر یہاں کسی کو کرنے کا کوئی کام نظر نہیں آتا ___ مسلم قائدین کے سیاسی ذوق نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے!

آدمی اکثر اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے

۱۔ سید محمد بن یوسف حسینی جونپوری (۱۵۰۴-۱۴۴۳ء) اپنے زمانہ کے ایک مسلمہ بزرگ تھے۔ اللہ کی ذات پر انھیں اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے اعلان کر دیا "انسان اگر اس دنیا میں دیدار الٰہی سے شرف نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو قلب یا چشم سر سے خواب یا بیداری میں نہ دیکھے تو مومن نہیں"۔ اُن کے سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ وہ "صدق و عزیمت میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔ بڑے قوی الاستعداد، صاحب تاثیر بزرگ تھے، دعوت الی اللہ، ہجرت فی سبیل اللہ، ایثار و زہد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

مگر اس تمام نیکی اور بزرگی کے باوجود اُن سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ وہی "مہدی موعود" اور "مہدی آخر الزماں" ہیں جن کے متعلق حدیثوں میں خبر دی گئی ہے، وہ فرقہ مہدویہ کے بانی ہوئے۔ اُن کی بزرگی اور تقدس اس قدر مسلم تھا کہ جب انھوں نے یہ دعویٰ کیا تو اس وقت کے ہندستان میں، جس میں افغانستان بھی شامل تھا، زبردست ہلچل پیدا ہو گئی۔ علماء و سلاطین سے لے کر عوام تک وہ گفتگو کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ مگر بعد کے نتائج ثابت کرتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ محض وہم پر مبنی تھا

۲۔ محمد حامد (۱۸۸۵-۱۸۴۴ء) جو بعد کو مہدی سوڈانی کے نام سے مشہور ہوئے، ایک خالص عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اُن کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا۔ انھوں نے ایک مسجد بنائی اور اس میں گوشہ نشین ہو کر تعلیم اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ شخصیت پُرکشش پائی تھی۔ اُن کے مریدوں اور شاگردوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ کافی مشہور ہو گئے۔ یہ شہرت اور مقبولیت اُن کے لئے غلط فہمی کا باعث بن گئی۔ ایک مورخ لکھتے ہیں:

لما کثر اتباعہ ومریدوہ اعتقد انہ المہدی المنتظر ثم اخذ ینشر دعوتہ و وزع منشورات علی الناس بانہ المہدی المنتظر۔ (جمال الدین الافغانی۔ صفحہ ۱۲۶)

جب اُن کے پیروؤں اور مریدوں کی تعداد بڑھ گئی تو وہ سمجھنے لگے کہ میں ہی مہدی ہوں پھر انھوں نے اپنی دعوت پھیلانی شروع کی اور لوگوں میں مشہور کیا کہ مہدی موعود وہی ہیں۔

اس زمانہ میں سوڈان پر انگریزوں کا غلبہ تھا اور وہ وہاں مظالم کر رہے تھے۔ "مہدی" ہونے کی حیثیت سے انھیں اس فتنہ کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اس طرح اُن کی خانقاہی زندگی میدان جنگ کی زندگی میں تبدیل ہو گئی۔ انھیں ابتدائی کامیابیاں ہوئیں مگر انگریزوں نے بالآخر اُن کے گروہ کو شکست دی اور انھیں کچل کر ختم کر دیا۔ "مہدویت" پر انگریزیت غالب آگئی۔

۳۔ ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸-۱۸۸۸ء) کو قدرت نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مگر اُن کی درج ذیل سطریں صرف یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ اپنے بارے

میں شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے :

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سروسامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے، مذہب، علوم و فنون، ادب و انشاء، شاعری کی کوئی ایسی وادی نہیں جس کی بے شمار راہیں مبدا رفیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالامال نہ ہوا ہو۔ بجز یکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معانی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اسی نے شاید سروسامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالہ کر دیا گیا۔"

۴۔ ابو طیب احمد بن حسین متنبی (۳۵۴ — ۳۰۳ھ) کوفہ کے ایک غریب گھر میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوفہ میں بھشتی کا کام کرتا تھا۔ متنبی بچپن سے بلند حوصلہ آدمی تھا اور بڑا بننے کا شوق رکھتا تھا۔ اس کا یہ جذبہ اولاً اس کو شاعری کی طرف لے گیا، کیونکہ اس زمانہ میں شہرت، دولت اور مرتبہ حاصل کرنے کا سب سے آسان ذریعہ شاعری تھا۔ مگر شاعر بننا اس کی طبیعت کو پوری طرح تسکین نہ دے سکا۔ اب اس نے بادشاہ بننے کا خواب دیکھا اور لوگوں کو اپنی خلافت کی بیعت پر ابھارنا شروع کیا۔ بیعت کا معاملہ پورا ہو جاتا تھا کہ علاقہ کے گورنر کو اس کے منصوبہ کی اطلاع ہو گئی اور اس نے اس کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ جیل خانہ سے اس نے گورنر کے نام ایک قصیدہ لکھ کر روانہ کیا اور اس میں معافی کی درخواست دی۔ گورنر نے اس کو رہا کر دیا۔

مگر بڑا بننے کا ذہن اب بھی اس کے اندر سے ختم نہ ہو سکا۔ اب اس نے ایک اور تدبیر کی۔ اس نے شام میں نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اپنی جادو بیانی اور اپنے ادبی زور سے بہت سے لوگوں کو اپنا معتقد بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ متنبی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔ آپ ہی نے تو میری آمد کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا لا نبی بعدی۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ مگر متنبی نے اعراب میں تغیر کر کے یہ مطلب نکالا : میرے بعد "لا" نامی شخص نبی ہوگا اور میرا نام آسمان میں "لا" ہے۔ اس نے قرآن کے مقابلہ میں اپنا کچھ کلام بھی پیش کیا۔

اس کے دعوے کو شہرت ہوئی تو اسے اخشیدیہ کے نائب امیر حمص نے گرفتار کر لیا۔ متنبی پریشان ہو گیا اور دعوے نبوت سے توبہ کر کے رہائی حاصل کی۔ اب اس کے معتقدین کا حلقہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد وہ مختلف بادشاہوں کی مدح کر کے دولت کماتا رہا۔ مگر اس کا سرداری کا مزاج اسے بار بار خود اپنے ممدوح سے ٹکرا دیتا تھا۔ بالآخر عضد الدولہ (شیراز) نے اس کو قتل کرا دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے متنبی نے اس کی مدح کر کے اس سے انعام و اکرام حاصل کیا تھا۔

اوپر کی تصویر: خام لوہا مشینوں کے ذریعہ ٹینکر میں بھرا جا رہا ہے

نیچے کی تصویر: جدید بندرگاہ کا عمومی منظر
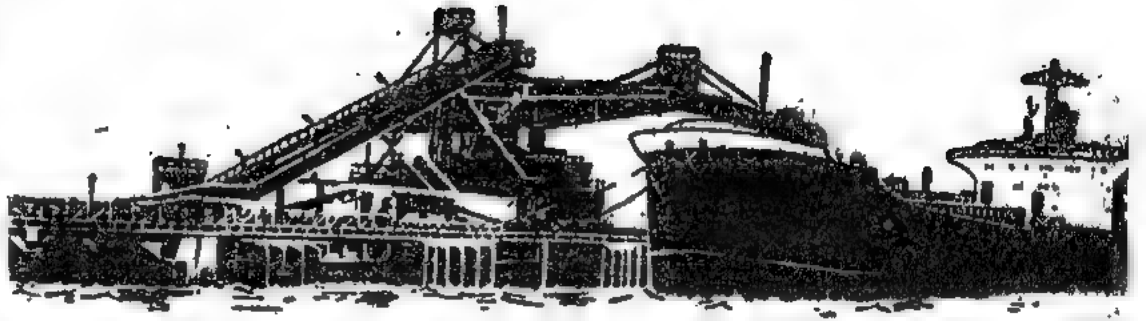
برآمدی تجارت کو ترقی دینے کے لئے بندرگاہ کو ترقی دینا ضروری

تجارتی نقل و حمل، قدیم زمانہ میں، خشکی اور تری سے ہوتی تھی۔ موجودہ زمانہ میں اگرچہ اس میں تیسرے ذریعے (فضائی) کا اضافہ ہوگیا ہے، تاہم آج بھی بین قوامی تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ سمندری جہازرانی ہی ہے۔

۱۹۴۷ میں ہندستان میں پانچ بڑی بندرگاہیں تھیں جن میں سے ایک وسکھاپٹنم کی بندرگاہ تھی۔ جاپان جو ہندستان میں خام لوہے کا سب سے بڑا خریدار رہے اس کو خام لوہے کی برآمد اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ مگر بڑھتی ہوئی برآمد اور نئے طریقوں کی ایجاد کے بعد یہ بندرگاہ ناکافی نظر آنے لگی۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں پہلی بار اس میں اتارنے چڑھانے کے مشینی آلات لگائے گئے۔ اس سے خام لوہے کی برآمدی تجارت کو کافی ترقی ہوئی۔

مگر اب سمندری جہازرانی میں زبردست تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ اشیاء کے نقل و حمل کے لئے بہت بڑے بڑے جہاز استعمال ہونے لگے ہیں۔ ان جہازوں کو بندرگاہ پر لانے کا انتظام اور ان پر سامان لادنے اور اتارنے کے لئے نئے نئے طریقے رائج ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں دوبارہ ضرورت تھی کہ وسکھاپٹنم کی بندرگاہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جائے۔

۸ دسمبر ۱۹۷۶ کو شپنگ اور ٹرانسپورٹ کے مرکزی وزیر ڈاکٹر جی۔ ایس۔ ڈھلون نے وسکھاپٹنم میں جس آؤٹر ہاربر کا افتتاح کیا ہے وہ اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔ جدید تعمیر کے بعد وسکھاپٹنم کی بندرگاہ دنیا کی دوسری اور ایشیا کی سب سے لمبی اور گہری بندرگاہ ہو گئی ہے۔ یہ جدید بندرگاہ جاپان کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے۔ اسی کی ایک علامت کے طور پر وسکھاپٹنم کی رسم افتتاح میں پنڈال کے اندر بڑی تعداد میں جاپانی موجود تھے۔

جدید بندرگاہ میں ایک لاکھ ڈیڈ ویٹ کی صلاحیت کے جہاز داخل ہو سکیں گے اور ان پر ۸ ہزار ٹن فی گھنٹہ

کی رفتار سے مال بھرا جاسکے گا۔ حکومت کے سامنے منصوبہ یہ ہے کہ اس صلاحیت میں مزید اضافہ کیا جائے۔ اور دو لاکھ ڈی ڈبلیو ٹی تک کے جہاز کی گنجائش پیدا کی جائے۔

تیل کے ٹینکر جو باہر سے ہندستان کے لئے تیل لاتے ہیں وہ بھی اسی بندرگاہ پر کھڑے ہوتے ہیں، منصوبہ یہ ہے کہ تیل کے لئے ایک علیحدہ "آئل جیٹی" بنائی جائے۔

وسکھاپٹنم کی اس بندرگاہ کی تعمیر کا کام فروری ۱۹۷۲ میں شروع ہوا تھا۔ اس بندرگاہ کو آسٹریلیا کی بندرگاہ کا مقابلہ درپیش تھا۔ جو جاپان کے لئے خام لوہے کا دوسرا بڑا مارکیٹ ہے۔ مگر جدید بندرگاہ کی تعمیر کے بعد یہ مسئلہ ختم ہوجائے گا۔ ابتداءً اس منصوبہ پر ۳۶ کروڑ ۹۷ لاکھ روپے کے خرچ کا اندازہ کیا گیا تھا۔ جس میں فارن ایکسچینج کی رقم ۸ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے کے بقدر تھی۔ مگر منصوبہ کی تکمیل تک اخراجات کی مقدار ۹۷ کروڑ ۲۶ لاکھ (زرمبادلہ: ۱۱ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے) تک پہنچ گئی۔

آندھرا پردیش کے ساحل پر واقع بندرگاہ کی یہ جدید تعمیر زیادہ تر ملکی مہارت اور ملکی ذرائع کی مدد سے کی گئی ہے۔ ہندستان نہایت تیزی سے صنعت اور ٹکنالوجی میں مکمل خود کفالتی دور کی طرف جا رہا ہے۔ اس بندرگاہ کے افتتاح کے موقع پر وسکھاپٹنم ٹرسٹ نے اعلان کیا کہ خام لوہے کی میکینکل ہینڈلنگ کے منصوبہ کی اس کامیابی کے بعد طے کیا گیا کہ آندھرا یونیورسٹی میں خاص اس موضوع کے مطالعہ کے لئے ایک "چیر" قائم کی جائے گی۔ یونیورسٹی کے اس شعبہ کا مقصد اشیاء کے چڑھانے اتارنے کا کام (Materials Handling systems) کا خصوصی مطالعہ کرنا ہوگا۔ ★

شفیق احمد انبالہ والا دہلی

خدائی قانون میں جانب داری نہیں ہوتی

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ قبیلہ کے لوگ سخت پریشان کہ اس کو سزا سے کیسے بچائیں۔ خود نبی اکرمؐ سے سفارش کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر کار حضرت اسامہؓ کو کسی طرح راضی کیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ آپ حضرت اسامہؓ کو بہت محبوب رکھتے ہیں اس لئے ان کی بات مان لی جائے گی۔ حضرت اسامہؓ نے جب یہ بات کہی تو سن کر آپ سخت ناراض ہوئے غصہ سے آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، اور فرمایا:

"اسامہؓ! کیا تم حدود اللہ کے معاملہ میں سفارش کرتے ہو؟"

پھر سب لوگوں کو جمع کیا، خطبہ دیا اور فرمایا:

"تم سے پہلی قومیں اسی لئے تباہ ہوگئیں کہ جب کوئی معزز آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب معمولی آدمی جرم کرتے تھے تو سزا پاتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔" ★

ریاض کانفرنس

کا مقالہ

انسانی تجربات انسان کو سچائی کے دروازہ تک پہنچا چکے ہیں۔ اب دین حق کے حاملین کو یہ کرنا ہے کہ وہ اٹھیں اور سچائی کے بند دروازہ کو کھول دیں۔ تاکہ انسانی قافلہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں داخل ہو جائے جہاں ان کا رب ان کا انتظار کر رہا ہے۔
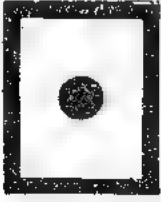
جدید سائنس قرآن کا علم کلام ہے

اسلامی ریاست ابتداءً مدینہ میں ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں قائم ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک شریعت اسلامی زمین کے بڑے حصہ پر بلا اختلاف جاری رہی ہے۔ ان تیرہ صدیوں میں اگرچہ سماجی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے، مگر کبھی یہ سوال نہیں اٹھا کہ شریعت اسلامی مخصوص وقت کے لئے تھی، وہ ہر زمان و مکان کے لئے موزوں نہیں۔ مدینہ کی ابتدائی ریاست، ایک سادہ عرب ریاست تھی جس میں پیغمبر اسلام نے اسلامی قانون کو جاری کیا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں شام، مصر، عراق، ایران، فلسطین کے متمدن علاقے اس کے تحت آگئے۔ مگر عمر فاروق اور علی مرتضیٰ کو نئے حالات پر اسلامی شریعت کو منطبق کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ دور عباسی میں ایک طرف اسلامی سلطنت کا سیاسی رقبہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ آسمان پر بادل کا ٹکڑا دیکھ کر ہارون الرشید کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ امطری حیث شئت فسیأتینی خراجك (جہاں چاہے برس، تیرا خراج مجھی کو پہنچے گا)۔ دوسری طرف یونان، مصر، ہند، چین کے علوم از سر نو زندہ ہوئے اور اسلامی معاشرہ علم و فن کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ مگر قاضی ابو یوسف وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے زیادہ متمدن سلطنت کا نظام اسلامی شریعت کی بنیاد پر چلانے میں پوری طرح کامیاب رہے۔ اس کے بعد مغلوں اور ترکوں کا دور آیا اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے ... اسلام کے ماتحت آگئے۔ مگر اول الذکر کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری اور مؤخر الذکر کے عہد میں المجلۃ العثمانیہ کا ترتیب پانا بتا ... ہے کہ انھوں نے شریعت کو اپنے بڑھتے ہوئے قانونی مسائل کے لئے عاجز نہیں پایا۔

پھر کیا وجہ ... کہ بیسویں صدی ہی میں ہم یہ آواز سنتے ہیں کہ "شریعت اسلامی ہر زمان و مکان کے لئے موزوں نہیں"۔ اس کی وجہ مستشرقین کا پروپیگنڈا نہیں، جیسا کہ بعض لوگ سادگی سے سمجھتے ہیں، بلکہ اس کی وجہ وہ عالمی فکری انقلاب ہے جو جدید سائنس کے زور پر پیدا ہوا ہے۔ ہر دور کا ایک رئیسی طرز فکر ہوتا ہے۔ اس کے تحت آدمی کے خیالات بنتے ہیں، اور ہر معاملہ میں اسی کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں۔ چند سو برس پہلے دنیا کا رئیسی طرز فکر مابعد الطبیعیاتی بنیادوں پر قائم تھا۔ پچھلے تمام معلوم زمانوں سے یہی طرز فکر چلا آرہا تھا۔ اور اسی کی بنیاد پر رائیں قائم کی جاتی تھیں۔ سائنس نے تاریخ میں پہلی بار اس طرز فکر کو اس کے مقام سے ہٹا دیا اور طبیعیاتی انداز فکر کو رئیسی حیثیت دے دی۔ مذہب اور جدید ذہن کے درمیان

موجودہ زمانہ کے تمام مسائل درحقیقت اسی تبدیلیٔ فکر کا شاخسانہ ہیں۔

قدیم زمانہ میں فلسفہ کو علوم کی ملکہ (کوئن آف آرٹ) سمجھا جاتا تھا۔ جدید سائنس کے ظہور کے بعد فلسفہ نے اپنا یہ مقام کھو دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کے بیانات میں فنی اتقان (Technical Perfection) ہوتا ہے، جب کہ فلسفہ کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔ سائنس کی اس خصوصیت نے جدید دنیا میں اس کو تمام علوم پر غالب کر دیا اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ طرز فکر پیدا ہوا جس کو عام طور پر ایجابیت (پازیٹوزم) کہا جاتا ہے۔ یعنی محسوس و مشہود واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ قدیم مابعدالطبیعیاتی طرز فکر کے لئے اس میں کوئی استبعاد نہ تھا کہ وہ روح کو آسمان سے نازل شدہ ایک غیر مرئی چیز سمجھے، اور اس مفروضہ کی بنیاد پر انسانی حرکات کی توجیہہ کرے مگر جدید ذہن نے چاہا کہ، دوسرے امور کی طرح، وہ اس کو بھی کیمیاتی اصطلاحوں میں بیان کرے۔ اس نے کہا کہ روح' طبیعی اور کیمیاوی مادوں کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہونے والی ایک وقتی کیفیت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ہوا میں دو شاخوں کی رگڑ سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

غیر طبیعی واقعات کی توجیہہ طبیعی اصطلاحوں میں کرنے کا یہ ذہن مذہب تک بھی پہنچا۔ مذہب کے آسمانی رشتہ کا مشاہدہ سائنسی ذرائع سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ مذہب کے وہ خارجی مظاہر انسان کے مشاہدہ میں آ رہے تھے جو ہر دور میں انسانی سماج کے اندر مذہب کے نام سے پائے جاتے رہے ہیں۔ اس لئے انھیں خارجی مظاہر کو مذہب کے سمجھنے کا مدار قرار دے دیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب الٰہیات (تھیالوجی) کے بجائے انسانیات (اینتھروپالوجی) کے مطالعہ کا موضوع بن گیا۔ اب انسانی سماج، مذہب کو جاننے کا ماخذ تھا، جب کہ اس سے پہلے مذہب آسمان سے ماخوذ سمجھا جاتا تھا۔ یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہ تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ریاض کی یہ مؤتمر (ذوقعدہ ۱۳۹۶) جو شریعت اسلامی کے موضوع پر ہو رہی ہے، مورخین کی جماعت اس کو "فرنیچر" کی تاریخ کے خانہ میں ڈال دے اور آئندہ اس کا مطالعہ فرنیچر کے عنوان کے تحت کیا جانے لگے۔

آج جب ایک شخص کہتا ہے کہ "مذہب و شریعت زمانی چیزیں ہیں" تو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوتا ہے کہ مذہب و شریعت سماجی عوامل کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ معلوم بات ہے کہ سماجی عوامل کے تحت پیدا ہونے والی چیزیں زمانی ہوتی ہیں۔ لباس اور فرنیچر ہر زمانہ میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مذہب و شریعت بھی قدرتی طور پر ایک زمانی ظاہرہ ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان مذہب کا مطالعہ اس نظر سے کرتا کہ اس کا مصدر وہی لازوال حقیقت اعلیٰ ہے جو نباتات کی روئیدگی، حیوانات کی پیدائش اور ستاروں کی گردش کو کنٹرول کر رہی ہے تو اس کو نظر آتا کہ مذہب ایک ابدی حقیقت ہے جس طرح طبیعیات اور حیاتیات کے قوانین ابدی ہیں۔ مگر مذہب کو "سماجی علوم" کے مطالعہ کا موضوع بنانے کی وجہ سے سارا معاملہ الٹ گیا۔

تاریخ انسانی کا یہ فکری موڑ جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں وقوع میں آیا، اسلام کے لئے انتہائی فیصلہ کن تھا۔ ضرورت تھی کہ مسلم قومیں اس سیلاب کے مقابلہ میں جوابی سیلاب بن کر اٹھیں اور تاریخ کے دھارے کو

اسلام کے مطلوبہ رخ کی طرف موڑ دیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے مصلحین معاملہ کی اصل نوعیت کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اس پورے معاملہ کو استعمار کا پیدا کردہ ایک سیاسی مسئلہ سمجھا اور دو سو برس کی انتہائی قیمتی مدت صرف سیاسی معرکہ آرائیوں میں ضائع کردی گئی۔ دور جدید کو سمجھ کر اس کے حسب حال احیائے اسلام کی جدوجہد کی منصوبہ بندی ہم نہ کر سکے۔

یہ چیلنج جو موجودہ زمانہ میں اسلام کو پیش آیا، کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں اسلام کے ابتدائی دور میں بھی اس کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا مقابلہ جس دنیا سے ہوا، وہ شرک کی دنیا تھی۔ مختلف ملکوں اور قوموں میں خدا کے رسول آتے رہے۔ انھوں نے متفقہ طور پر لوگوں کو توحید کی طرف بلایا، مگر عالمی رائے عامہ نے دعوت توحید کو رد کر دیا اور زندگی کے تمام شعبے شرک کی بنیادوں پر قائم ہو گئے۔ اس زمانہ میں شرک اتنا طاقتور تھا کہ توحید کی آواز بلند کرنے والوں کو آرے سے چیر دیا جاتا تھا۔ جس نظام میں اقتصادیات دیوتاؤں کے نام پر لگنے والے بازاروں سے وابستہ ہو گئی ہو، اور جہاں ایک بادشاہ حکومت کرنے کا حق یہ کہہ کر حاصل کرتا ہو کہ وہ فلاں دیوتا کی اولاد ہے، وہاں توحید کے پیغام کو کس طرح برداشت کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت اللہ نے اپنے آخری رسول کو بھیجا اور اس کو لیظہرہ علی الدین کلہ کی نسبت عطا فرمائی۔ اللہ کی اس نصرت کے بل پر اسلام کے نمائندے توحید کا پیغام لے کر اٹھے اور اس طاقت کے ساتھ اس کو پیش کیا کہ انسانیت کا قافلہ ایک نئی راہ پر چل پڑا۔ لندن کی ایک تازہ انسائیکلوپیڈیا (۱۹۷۴) میں "اسلام" کے مقالہ نگار نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے: اسلام نے تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

ISLAM CHANGED THE COURSE OF HUMAN HISTORY

اسلام نے انسانی تاریخ پر کیا انقلابی اثرات ڈالے۔ یہ ایک علیحدہ اور مستقل موضوع ہے۔ تاہم مثال کے طور پر میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ آرنلڈ ٹائن بی نے لکھا ہے کہ فطرت کی طاقتیں اول روز سے زمین پر موجود تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی تسخیر صرف حالیہ سائنسی انقلاب کے بعد ہو سکی۔ پھر وہ خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس تسخیر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ شرک (مظاہر پرستی) کا عقیدہ تھا جو پچھلے تمام زمانوں میں مسلسل انسان کے اوپر ایک غالب فکر کی حیثیت سے چھایا رہا ہے۔ شرک کے عقیدہ نے فطرت کی طاقتوں کو دیوتا بنا دیا۔ مشرک انسان کے نزدیک یہ طاقتیں پرستش کا موضوع تھیں نہ کہ تسخیر کا موضوع۔ یہ تمام تر عقیدۂ توحید کا کرشمہ ہے کہ انسان نے ان طاقتوں کو اپنی ہی قسم کی مخلوق کی نظر سے دیکھا اور ان کو مسخر کیا۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان جدید الحاد کے مقابلہ میں وہی رول ادا نہ کر سکے جو ان کے اسلاف نے قدیم شرک کے مقابلہ میں ادا کیا تھا۔ ورنہ آج نہ صرف یہ کہ ہم دفاع کی پوزیشن میں نہ ہوتے بلکہ خود انسانیت کی تاریخ بھی دوسری ہوتی۔ جس طرح ہزار برس پہلے ہمارے اسلاف نے اللہ کی تائید سے دنیا کی تاریخ بدل دی تھی۔

تاہم اللہ ہر امر پر غالب ہے۔ وہ عالم انسانی کے واقعات پر مستقل نظر رکھتا ہے، اور اپنے فیصلہ کے تحت

حق کا احقاق اور باطل کا ابطال کرتا رہتا ہے۔ وہ کام جس کو کرنے میں مسلمان ناکام ثابت ہوئے تھے، اس کو اللہ نے، حیرت انگیز طور پر، خود مغربی اقوام کے ہاتھوں انجام دلا دیا ہے۔ مغربی سائنس کی بعد کی تحقیقات نے وہ تمام نظریاتی بنیادیں منہدم کر دیں جو مذہب و شریعت کو بے اصل یا زمانی ثابت کرنے کے لئے علم جدید نے وضع کی تھیں۔

انسان کو غلط راہوں میں بھٹکنے سے بچانے کے لئے قرآن نے دو انتہائی بنیادی باتوں کی نشان دہی کی تھی۔ ایک یہ کہ انسان کو چاہئے کہ وہ حقیقت کا غیبی طور پر اقرار کرے، اگر اس نے اصرار کیا کہ اس کو حقیقت کا براہ راست مشاہدہ کرایا جائے تو وہ سچائی کو نہیں پا سکتا (هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ)

دوسرے یہ کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اس امر واقعہ کا اعتراف کرے کہ وہ اپنی زندگی کا قانون خود اپنے علم کے ذریعہ دریافت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اپنا قانون خود وضع کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ صورت واقعہ کے سراسر خلاف ہوگا۔ (وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ)

موجودہ دور میں ان دونوں باتوں کو مذہبی خوش اعتقادی پر محمول کیا گیا۔ کہا گیا کہ ان کے پیچھے کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔ مگر سائنس کی بعد کی دریافتوں نے حیرت انگیز طور پر ثابت کیا ہے کہ انسان کے لئے واحد قابل عمل موقف وہی ہے جو قرآن میں بتایا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا موقف، علمی طور پر، اس کے لئے ہو ہی نہیں سکتا۔

یہود نے تین ہزار برس پہلے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ارنا اللہ جھرۃ۔ ٹھیک یہی بات موجودہ زمانہ میں علم کے نام پر دہرائی گئی۔ سائنسی ذرائع کے استعمال سے جب ایسے بے شمار مخفی حقائق انسان کے علم میں آئے جن کو وہ اس سے پہلے نہیں جان سکتا تھا، تو کہا گیا کہ سائنس نے انسانی حواس کی محدودیتوں کی تلافی کر دی ہے اور اب ہر موجود چیز کو انسان کے براہ راست مشاہدہ میں آجانا چاہئے۔ سائنسی ذرائع کے استعمال کے بعد بھی اگر کوئی چیز ہمارے مشاہدہ میں نہیں آتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جب معلوم ہوا کہ سائنسی آلات خوردبینی کیڑوں سے لے کر بعید ترین اجرام تک کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، مگر مذہبی حقائق ان کے مشاہدہ میں نہیں آئے، تو سمجھ لیا گیا کہ ان کی کوئی واقعی حقیقت نہیں۔

مگر بیسویں صدی کا آغاز اس ذہن کے خاتمہ کے ہم معنی بن گیا۔ روشنی کی تعبیر ذرات ([illegible]) سے کرنے کے سلسلے میں ناکامی نے بتایا کہ کائنات میں ایسی حقیقتیں ہیں جن کو طبیعی اصطلاحوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایٹم کے ٹوٹنے سے معلوم ہوا کہ اشیار ابتدائی سائنسی اندازوں سے بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ ہم جتنی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں، ان سے کہیں زیادہ تعداد ان چیزوں کی ہے جو ہمارے آلات کی گرفت میں نہیں آتے۔ حتیٰ کہ بلیک ہول تھیری کے مطابق خود کثیف اجسام کا بھی صرف ۳ فی صد حصہ ہمارے لئے قابل مشاہدہ ہے، بقیہ ۹۷ فی صد حصہ وہ ہے جس کو ہم کبھی نہیں دیکھ سکتے۔

جب کائنات اس سے زیادہ اشیار کا مجموعہ ہے جو ہمارے براہ راست مشاہدہ میں آتی ہیں تو بقیہ ناقابل

مشاہدہ چیزوں کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے۔ یہاں سائنس دانوں کو ذرائع علم میں مشاہدہ (OBSERVATION) کے ساتھ استنباط (INFERENCE) کا اضافہ کرنا پڑا۔ پہلے دور کی علامت اگر نیوٹن تھا تو دوسرے دور کی علامت آئن سٹائن ہے۔ اس سلسلہ میں آئن سٹائن کے نظریات کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

IN DEALING WITH THE ETERNAL VERITIES, THE AREA OF EXPERIMENT IS REDUCED AND THAT OF CONTEMPLATION ENHANCED

اس طرح سائنس نے گویا اس واقعہ کا اعتراف کر لیا کہ انسان کے لئے ایمان بالغیب (ظواہرِ کون کو دیکھ کر حقائق کون کو ماننا) کا طریقہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

نظریۂ علم (THEORY OF KNOWLEDGE) میں یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہے۔ اس نے سچائی کا وہ دروازہ کھول دیا ہے جو دو سو برس سے بند پڑا ہوا تھا۔ سائنس نے جو کائنات دریافت کی تھی، وہ حیرت انگیز طور پر ایک انتہائی بامعنیٰ کائنات تھی۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنی ایک توجیہہ (EXPLANATION) مانگ رہی تھی۔ مگر توجیہہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک استنباطی چیز ہے نہ کہ مشاہداتی۔ اس لئے سائنس انیسویں صدی کے آخر تک اس سے گریز کرتی رہی۔ اب "استنباط" کو سائنسی علم کے زمرہ میں داخل کرنے کے بعد سائنس نے استنباطی توجیہہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ نیوٹن کے الفاظ کو دوبارہ دہرایا جا سکے کہ نظام عالم کے پیچھے ایک خدائی بازو (DIVINE ARM) کام کر رہا ہے۔ حرکت، زندگی، حسن، معنویت، حکمت، عظمت اور پراسرار خواص کا وہ مجموعہ جس کو کائنات کہا جاتا ہے، اس کی کوئی توجیہہ اس کے سوا نہیں بنتی کہ اس کو ایک زندہ اور باشعور خدا کی کارفرمائی تسلیم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ استنباطی استدلال کو ایک جائز طریق استدلال ماننے کے بعد پوری کی پوری سائنس قرآن کا علم کلام بن گئی ہے۔ وہ قرآنی عقائد کو علمی سطح پر ثابت کر رہی ہے۔ کمی جو ہے وہ صرف یہ کہ سائنس کی دریافتوں کو ابھی تک قرآنی کلامیات کے طور پر مرتب نہیں کیا گیا۔

یہاں مثال کے طور پر میں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنا ایک جوڑا رکھتی ہے۔ مقناطیس کے ایک ٹکڑے کو کاٹیں تو وہ فوراً اپنا ایک ساؤتھ پول اور نارتھ پول پیدا کرے گا۔ اسی طرح ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں اپنے وجود کو برقرار رکھتی ہے۔ پارٹیکل کا اینٹی پارٹیکل، ایٹم کا اینٹی ایٹم، حتیٰ کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ۔ اینٹی ورلڈ کو ملائے بغیر ہم موجودہ ورلڈ کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یقین کیا جاتا ہے ہے کہ موجودہ دنیا کے اندر ایک اور متوازی دنیا موجود ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ دوسری دنیا (اینٹی ورلڈ) ہماری موجودہ دنیا کے مقابلہ میں کچھ زیادہ خواص رکھتی ہے۔ مثلاً ہماری دنیا فانی ہے جب کہ دوسری دنیا (اینٹی ورلڈ) کے اندر بقا کی صلاحیت ہے۔ وغیرہ

یہ حیرت انگیز طور پر قرآن کی تصدیق ہے۔ قرآن میں کہا گیا تھا: وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔ یعنی دنیا کی تمام چیزوں کو ہم نے اس طرح بنایا کہ جوڑے کے بغیر کسی چیز کا وجود ممکن نہیں۔ تاکہ تم غور

کرکے اس حقیقت تک پہنچو کہ پورے عالم کا بھی ایک جوڑا ہونا ضروری ہے، اور وہ آخرت ہے۔

یہی موجودہ زمانہ کی تمام سائنسی دریافتوں کا حال ہے۔ یہ دریافتیں حقیقۃً عالم کون کے اندر چھپے ہوئے "آلاء اللہ" کا ظہور ہیں۔ یہ اس پیشین گوئی کی تکمیل ہے جو قرآن میں تیرہ سو برس پہلے کی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔

جدید دریافتوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے آخری طور پر متحقق کر دیا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا قانون خود دریافت نہیں کر سکتا۔

یہ بات اب غیر مشتبہ طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے ذرائع اس کو صرف جزوی علم تک پہنچاتے ہیں۔ اس واقعہ کا سب سے زیادہ معنی خیز پہلو یہ ہے کہ جو باتیں ہمارے علم میں نہیں آتیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے بہت زیادہ اہم ہوتی ہیں جو ہمارے علم میں آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ ریڈیم کے الکٹران ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ ریڈیم کا ٹکڑا ایک غیر تابکار عنصر (سیسہ) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ الکٹران کیوں ٹوٹتے ہیں۔ وہ کون سی طاقت ہے جو بے شمار الکٹران میں سے ایک الکٹران کے لئے ایک وقت خاص میں قضا کا حکم بن کر آتی ہے۔ اس اہم ترین سوال کے بارے میں سائنس دانوں کی تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک سائنس داں کو کہنا پڑا کہ "یہ شاید خداؤں کے اختیار میں ہے، خواہ وہ جو بھی ہوں۔"

یہی تمام اشیاء کا حال ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں:

THE IMPORTANT IS UNKNOWABLE, AND THE KNOWABLE IS UNIMPORTANT

(جو اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے اور جو قابل دریافت ہے وہ اہم نہیں)

یہ بات جو سائنسی دنیا کے بارے میں دریافت ہوئی ہے، یہ اس مسئلہ کے بارے میں انتہائی اہمیت رکھتی ہے جس کو ہم "انسانی قانون کا مسئلہ" کہتے ہیں۔ کیونکہ انسان، ریڈیم کے ایک ٹکڑے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پیچیدہ وجود ہے۔ پھر جب ہم دھات کے ایک ٹکڑے کے قانون کو صحیح طور پر دریافت نہیں کر سکتے تو انسانی زندگی کا قانون کس طرح معلوم کر سکتے ہیں۔

سائنس نے بتایا ہے کہ انسان کی ہستی اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جیسا کہ قدیم زمانہ میں سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کا تعلق ساری کائنات سے ہے۔ وہ بیک وقت علم الخلایا سے لے کر فلکیات تک اور نفسیات سے لے کر اقتصادیات تک بے شمار علوم کا موضوع ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انسان کو صحیح طور پر جاننے کے لئے ساری کائنات کا علم ضروری ہے۔ مگر ٹھیک اسی وقت ہماری تحقیق نے بتایا کہ انسان کچھ ایسی لازمی محدودیتوں کا شکار ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ حقیقت کو اس کی وسیع اور کلی شکل میں دیکھ سکے۔ انیسویں صدی میں قانون انسانی کے مطالعہ کو "سوشل انجینیرنگ" سے تعبیر کیا گیا تھا۔ گویا جس طرح ایک انجینیر

لوہے کی ایک مشین کے لئے پائدار اور غیر متبدل قوانین وضع کرتا ہے، اسی طرح ماہرین قانون انسانی زندگی کے لئے بھی ایک قانونی ڈھانچہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر قانون انسانی کا کوئی متفقہ معیار دریافت کرنے میں مکمل ناکامی ہوئی۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم ایسی کتابیں پڑھتے ہیں جن کا ٹائٹل ہوتا ہے:

قانون اپنی تلاش میں law in quest of itself

علم قانون (JURISPRUDENCE) طویل تلاش کے بعد بالآخر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہا ہے کہ خالص علمی طریق پر زندگی کا قانون انسان کے لئے قابل دریافت (Discoverable) نہیں ہے۔ ہماری حیاتیاتی اور ذہنی محدودیتیں ([illegible]) ہماری راہ میں فیصلہ کن طور پر حائل ہیں۔ جارج وائٹ کراس پیٹن نے اعتراف کیا ہے کہ قانونی معیارات کا کوئی متفقہ مجموعہ پانے کی صورت عملاً اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ وحی آسمانی کو قانون کا ماخذ مان لیا جائے!

انیسویں صدی میں مغرب میں سماجی قانون کے جتنے فلسفے پیدا ہوئے، سب کسی نہ کسی طرح اس کے دعوے دار تھے کہ سماجی قانون، طبیعی قانون کی طرح، خلقی ([illegible]) طور پر سماج کے اندر موجود ہوتا ہے۔ ہمارا کام صرف اس کو "دریافت" کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی قانون بھی اسی طرح ابدی ہے جس طرح بھاپ اور بجلی کے قوانین۔ یہ تمام فلسفے سماجی قانون کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ تاہم میں کہوں گا کہ اصولی طور پر ان کا موقف صحیح تھا۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ ایک صحیح چیز کو غلط جگہ تلاش کر رہے تھے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسانی زندگی کا قانون بھی، طبیعیات و حیاتیات کے قوانین کی طرح، ابدی طور پر مقرر ہے۔ مگر اس قانون کو معلوم کرنے کی جگہ وحی الٰہی ہے نہ کہ وہ انسانی علوم جن کے متعلق ہم خود دریافت کر چکے ہیں کہ وہ جزوی معلومات کے سوا ہمیں کچھ نہیں دیتے۔

انسانی قانون کو الٰہی ذریعہ سے قابل اخذ ماننے کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، اس کو کائناتی قانون کی سطح پر رکھنا ہے۔ یعنی جس منبع سے ساری کائنات اپنا قانون لے رہی ہے وہیں سے انسان بھی اپنا قانون اخذ کرے۔ یہ چیز انسانی قانون کو ابدیت کے خانہ میں ڈال دیتی ہے۔ کائناتی قانون کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مسلمہ طور پر غیر متغیر ہے۔ پانی جس قانون تجاذب کے تحت دو گیسوں کے ملنے سے وجود میں آتا ہے اور جس قانون حرارت کے تحت اس کے مالیکیول جدا ہو کر بھاپ کی شکل میں اڑنے لگتے ہیں۔ وہ ہر مقام اور ہر زمانہ میں یکساں ہیں۔ پھر خدا کے قوانین جب طبیعیات اور حیاتیات کی دنیا میں ابدی ہیں تو انسانی معاشرہ کے لئے اس کے قوانین غیر ابدی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی ماخذ سے نکلے ہوئے دو قوانین دو الگ الگ نوعیت کے نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون کو خدا سے ماخوذ ماننا ہی اس کو زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماورا ثابت کر دیتا ہے۔

قانونِ کائنات کی ابدیت اس کے باوجود ہے کہ اس کے اندر بے شمار قسم کے تغیرات ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانہ کا انسان ستاروں کی بابت عقیدہ رکھتا تھا کہ دن کے وقت ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ

رات کی قندیلیں ہیں جو آسمان پر دیوتاؤں کے لئے جلائی جاتی ہیں۔ اسی طرح چاند کے گھٹنے بڑھنے کو وہ حقیقی سمجھتا تھا۔ سورج کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ صبح کو "نکلتا" اور شام کو "ڈوب" جاتا ہے۔ یہ تغیرات آج "آنکھ کا دھوکا" ثابت ہو چکے ہیں۔ تاہم جدید انسان نے دوسرے اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے تغیرات کا مشاہدہ کیا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ان ظاہری تغیرات سے قوانین کی ابدیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حیاتیات کی دنیا، جدید دریافت کے مطابق، مسلسل تغیرات کا شکار رہتی ہے۔ علم الخلایا نے بتایا ہے کہ انسانی جسم کے تمام اعضاء بال اور ناخن سے لے کر گوشت اور خون تک ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی سائنس داں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ حیاتیات اور عضویات کے علم کو ہر سال بدلا جائے، اور ان کو بار بار "نئے حالات" کے مطابق مدون کیا جاتا رہے۔ کیوں کہ گہرا مطالعہ بتا رہا تھا کہ تغیرات کے ماورا جو انسانی وجود ہے، وہ تبدیلیوں کے باوجود، ایک حالت پر باقی رہتا ہے اور ایک ہی مستقل قانون کے تحت عمل کرتا ہے۔

اب ہم اپنی گفتگو کے آخری حصہ پر آتے ہیں: "کیا کوئی براہ راست قرینہ بھی موجود ہے جو اس دعوے کی صداقت ثابت کرتا ہو کہ انسان کو اپنا قانون خدا کے ابدی سرچشمہ سے اخذ کرنا چاہئے"۔ جواب یہ ہے کہ کم از کم دو ایسے قرینے یقینی طور پر موجود ہیں۔ ایک انسانی فطرت، دوسرے انسانی ساخت کے قوانین کا تجربہ۔

لارڈ ایکٹن نے بجا طور پر کہا تھا:

POWER CORRUPTS AND ABSOLUTE POWER CORRUPTS ABSOLUTELY

(اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل بگاڑ دیتا ہے)

انسان کے بارے میں ساری تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی انسان کو مطلق اختیار حاصل ہوا ہے، اس نے ظلم و فساد پیدا کیا ہے۔ انسان کی ساخت بتاتی ہے کہ وہ کسی برتر اقتدار کے ماتحت رہ کر ہی صحیح کام کر سکتا ہے۔ لامحدود اختیارات لازماً اس کو بگاڑ کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ بات اس سے پہلے صرف اخلاقی اصطلاحوں میں کہی جاتی تھی۔ مگر اب خود علم الحیات سے اس کا ثبوت ملنا شروع ہو گیا ہے۔ امریکہ کے مشہور بیالوجسٹ پروفیسر بی۔ ایف۔ اسکنر اور ان کے ساتھیوں نے اس مسئلہ کا مطالعہ خالص حیاتیاتی سائنس کی روشنی میں کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیق کو تازہ مطبوعہ کتاب BEYOND FREEDOM AND DIGNITY میں درج کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی ساخت کے اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہ آزادی کا تحمل کر سکے:

WE CAN'T AFFORD FREEDOM

وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کو لامحدود آزادی نہیں بلکہ پابند نظام (Disciplined Culture) چاہئے۔ یہی اس کی حیاتیاتی فطرت کے زیادہ مطابق ہے ——— حیاتیاتی سائنس کے یہ تجربات قرآن کے اس بیان کی بالواسطہ طور پر تصدیق کر رہے ہیں: يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ

کُلّہٗ لِلّٰہ۔

اس کے بعد جب ہم انسانی قانون سازی کے تجربات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو اس سے بھی یہی قرینہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان اپنا قانون دریافت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہاں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق چند تقابلی مثالیں دوں گا۔

۱۔ شرعی قانون میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ وضعی قانون میں اس کو تجارتی سودے پر قیاس کرتے ہوئے جائز سمجھا گیا ہے۔ اگر بے لاگ طور پر دیکھا جائے تو تجربہ پوری طرح شرعی قانون کی برتری ثابت کرتا ہے۔ سود کی حرمت کی بنا پر مسلم ملکوں میں ایک ہزار سال تک اقتصادی نظام چلتا رہا۔ مگر کبھی یہ نوبت نہ آئی کہ ایک طرف دولت کا انبار ہو اور دوسری طرف افلاس کا انبار۔ جدید اقتصادی نظام جو سود کی بنیاد پر قائم ہے اس نے انسانی سماج میں پہلی بار یہ غیر متوازن صورت حال پیدا کی ہے۔ اور موجودہ نظام کے اندر اس کا کوئی حل نہیں۔

لین دین کی تمام شکلوں میں سود واحد طریقہ ہے جو دولت کی گردش کے عمل کو یک طرفہ بنا دیتا ہے۔ سود کی یہی وہ خصوصیت ہے جس سے مل کر جدید صنعتی نظام ایک استحصالی نظام میں تبدیل ہو گیا۔ اور نتیجۃً موجودہ صدی کی وہ دو سب سے بڑی برائیاں وجود میں آئیں جن میں سے ایک کا نام اشتراکی جبر اور دوسرے کا نام دوسری عالمی جنگ ہے۔ مارکس اور انیسویں صدی کے دوسرے معاشی مفکرین جنھوں نے انفرادی ملکیت کی تنسیخ میں اقتصادی عدل کا راز تلاش کیا وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ صنعتی نظام کو جس چیز نے استحصال کا نظام بنایا ہے، وہ اس کے ساتھ سودی سرمایہ کاری کا جوڑ ہے نہ کہ انفرادی ملکیت کا جوڑ۔ اگر وہ اس راز کو پالیتے تو وہ سود کی منسوخی کی وکالت کرتے، اس کے بجائے انھوں نے ملکیت کی منسوخی کا طریقہ اختیار کرکے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ البتہ انسانیت کے ایک بڑے حصہ کو تاریخ کے سب سے بڑے اجتماعی عذاب میں اس طرح قید کر دیا کہ وہ اس سے نکلنا چاہے بھی تو نہ نکل سکے۔

تاہم ہٹلر نے سود کی اس شناعت کو محسوس کر لیا تھا۔ یہودی سرمایہ دار، دوسری عالمی جنگ سے پہلے، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں کی معاشیات پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے۔ ہٹلر نے اس مسئلہ کا بغور مطالعہ کیا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ یہودیوں کے اقتصادی غلبہ کی وجہ سود ہے۔ اگر سود کو قانونی طور پر ناجائز قرار دے دیا جائے تو یہودی سرمایہ داری اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح کسی ذی حیات کے جسم سے اس کا خون نکال لیا جائے۔ مگر اس کا بڑھا ہوا انتقامی جنون بعد کو اسے اقتصادی حل کے بجائے فوجی حل کی طرف لے گیا اور اس نے نہ صرف جرمنی بلکہ سارے یورپ سے یہودیوں کے استیصال کے لئے تاریخ کی ہولناک ترین جنگ چھیڑ دی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ کے بچے کھچے یہودی امریکہ پہنچ گئے۔ پچھلے تیس برس میں اس قوم نے امریکہ کے سودی اداروں کو اپنے ہاتھ میں لے کر امریکہ کی اقتصادیات پر دوبارہ اسی طرح قبضہ کر لیا ہے جس طرح انھوں نے اس سے پہلے یورپ کی اقتصادیات پر قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ نازی جرمنی کی طرح امریکہ میں بھی ان کے خلاف نفرت کا آغاز ہو چکا ہے

حتیٰ کہ مبصرین پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ عجب نہیں کہ مستقبل میں امریکہ میں بھی ان کے خلاف کوئی "ہٹلر" پیدا ہو جائے۔

یہی صورت حال ایک اور شکل میں "زیر ترقی ممالک" میں پیش آرہی ہے۔ یہ ممالک اپنی ترقیاتی اسکیموں کے لئے ترقی یافتہ ممالک سے قرضہ لینے پر مجبور تھے۔ یہ قرضہ، موجودہ اقتصادی نظام کے تحت، انھیں سودی شرائط پر ملا۔ سود کی اقتصادی کرامت کے نتیجہ میں قرضوں کی یہ رقم بڑھتے بڑھتے اب اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ کئی مدیون ملک اپنی سالانہ قسطوں کی ادائیگی کے لئے خود دائن ملکوں سے دوبارہ قرض لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اکثر ملکوں کا یہ حال ہے کہ اگر انھیں یہ سارے قرضے مع سود ادا کرنے پڑیں تو وہ مکمل طور پر دیوالیہ ہو جائیں۔

۲۔ شریعت اسلامی کا تصور سزا اس بنیاد پر قائم ہے کہ انسان ایک با اختیار مخلوق ہے۔ وہ بالقصد اپنے ارادے کے تحت جرم کرتا ہے اس لئے مجرم کو ایسی سزا دینا چاہئے جو دوسروں کے لئے عبرت (نکال) بن سکے۔ لوگ اس کے انجام کو دیکھ کر ڈر جائیں اور آئندہ جرم کرنے سے باز رہیں۔ اس کے مطابق شریعت عمداً ندی میں قاتل کی سزا قتل مقرر کی گئی۔ مگر اٹھارویں صدی کے آخر میں یورپ میں جرمیات (Criminalogy) کا ایک نیا فلسفہ وضع ہوا۔ اس کے مطابق جرم کوئی ارادی واقعہ نہ تھا، بلکہ اضطراری واقعہ تھا۔ اس کے اسباب حیاتیاتی ساخت، ذہنی بیماری، معاشی تنگی، سماجی حالات وغیرہ میں بتائے گئے۔ کہا گیا کہ مجرم کو مجرم کے بجائے مریض سمجھنا چاہئے۔ اور سزا دینے کے بجائے اس کے "علاج" کا انتظام کرنا چاہئے۔

اس نظریہ نے جدید دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اکثر ملکوں میں جیل خانوں کے بجائے اصلاح خانے بنائے گئے اور اخلاقی جرائم کی حد تک سنگین سزاؤں کو ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی ہر ملک میں دفاعی اہمیت کے جرائم کے لئے سنگین سزائیں بدستور جاری رہیں اور یہ واقعہ اس نظریہ کے علم برداروں کی بے یقینی ثابت کرنے کے لئے کافی تھا۔ تاہم انسانی فطرت کے بارے میں بعد کی تحقیقات اور عملی تجربوں نے مزید اس نظریہ کی غلطی واضح کر دی ہے۔ خوش حال اور "صحت مند" معاشروں میں لوگوں کے اندر جرائم کا رجحان اس سے بھی زیادہ پایا گیا جو نسبتاً غریب اور غیر صحت مند معاشروں میں نظر آتا ہے۔ "معالجاتی" تدبیریں جرائم کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ جن ملکوں میں سزاؤں میں تخفیف کے اصول کو جاری کیا گیا، وہاں اس کے بعد جرائم کی رفتار بہت بڑھ گئی۔ کئی ملکوں مثلاً سری لنکا اور ڈیلاویر (Delaware) میں سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اس کو بحال کرنا پڑا۔ چنانچہ ماہرین قانون اب اپنے سابقہ نظریہ پر نظر ثانی کے لئے مجبور ہو رہے ہیں۔ ایک ماہر قانون نے کہا ہے: "لوگوں میں یہ عام تاثر ہونا کہ کسی بھی شخص کو قتل کرنا ملزم کو موت کی سزا کا مستحق بناتا ہے اپنے اندر بہت بڑی مانع قدر (Deterrent Value) رکھتا ہے۔

اس کے برعکس شرعی قانون کی افادیت کا زندہ ثبوت وہ ممالک ہیں جہاں آج بھی شرعی سزا نافذ ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب۔ یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ یہاں، مہذب ممالک کے مقابلہ میں جرائم کی تعداد انتہائی حد تک کم ہے۔

۳۔ اسی طرح ایک مثال عورت مرد کے درمیان تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اسلامی شریعت کے نزدیک مرد اور عورت ایک دوسرے کا تکملہ (Complements) ہیں۔ بعضکم من بعض (آل عمران) اس کے برعکس جدید تہذیب کا دعویٰ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کا مثنیٰ (Duplicates) ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر کا تقاضا ہے کہ دونوں صنفوں کا دائرہ کار الگ الگ ہو۔ چنانچہ شریعت اسلامی میں مقرر کیا گیا کہ، اصولی طور پر، عورت کا دائرہ کار گھر اور مرد کا دائرہ کار باہر ہوگا۔ جب کہ مغربی فکر کا تقاضا تھا کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی میدان عمل میں سرگرم ہوں۔ دونوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق و تقسیم نہ رکھی جائے۔

مغربی ملکوں میں انیسویں صدی میں مساوات مرد و زن کے اصول کو رائج کیا گیا۔ مگر سو برس تک عمل ہونے کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ عورت کسی بھی شعبہ میں مرد کی جگہ لے سکتی۔ اس تجرباتی ناکامی نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ مسئلہ کا از سر نو جائزہ لیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس مسئلہ پر مغربی ممالک، خصوصاً امریکہ میں غیر معمولی تحقیقات ہوئی ہیں۔ یہ تحقیقات حیرت انگیز طور پر شرعی نقطۂ نظر کی تصدیق کر رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ نہ صرف دونوں کی نفسیات الگ الگ ہیں۔ بلکہ دونوں کے درمیان فیصلہ کن قسم کے حیاتیاتی فروق (...) پائے جاتے ہیں۔ اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی کام کے لئے موزوں نہیں۔

پھر دونوں نظریات کی بنیاد پر جو خاندانی اور معاشرتی زندگی بنتی ہے، وہ بھی اب مکمل طور پر سامنے آچکی ہے مرد و عورت کے بارے میں شرعی اصول پر زمین کے ایک بڑے رقبہ میں تیرہ صدیوں تک عمل ہوتا رہا۔ مگر زندگی کے نظام میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی۔ جب کہ مغربی زندگی میں "مساوات" کے جدید اصول کے انطباق نے پورے معاشرہ کو بگاڑ دیا ہے اور خاندانی زندگی بالکل منتشر ہو کر رہ گئی ہے۔

عورت کو گھر کے باہر کے امور سپرد کرنے کے نتیجہ میں مغرب میں جو بے شمار مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کی تفصیل پیش کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں میں اس کے صرف دو پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ ایک، بچوں کا اپنے سرپرستوں کی تربیت سے محروم ہونے کا مسئلہ۔ مغربی سماج میں یہ صورت عام ہے کہ باپ اور ماں دونوں کے بیرونی کام پر چلے جانے کی وجہ سے بچوں کو اپنے فطری مربیوں کے درمیان رہنے کا موقع نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ عورت مرد کے آزادانہ اختلاط کے نتیجہ میں بار بار نئی صنفی دلچسپیاں وجود میں آتی ہیں اور طلاقوں کی کثرت سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو اجڑے گھروں (...) کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح جو بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہو کر پرورش پاتے ہیں ان کی شخصیت کا فطری ارتقاء نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ بچوں میں کثرت سے ایک نئی قسم کی نفسیاتی بیماری پیدا ہو رہی ہے جس کو امریکی ڈاکٹروں نے آٹزم (...) کا نام دیا ہے۔ جسمانی طور پر بظاہر تندرست بچے ذہنی اعتبار سے عجیب و غریب قسم کے امراض کا شکار ہوتے ہیں، مثلاً وحشت زدگی، ساتھیوں سے لڑنا۔ اسکول کا کام نہ کرنا۔ تشدد پسندی وغیرہ۔ ان کے علاج کی ہر تدبیر اب تک ناکام ثابت ہوئی ہے۔

دوسرا مسئلہ بڑوں سے متعلق ہے۔ بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ بڑے اپنے عزیزوں اور مخلصوں سے۔ فرانس کی ایک رپورٹ کے مطابق فرانس میں انسانوں کی ۵۲ ملین آبادی میں سات ملین کتے ہیں۔ یہ کتے اپنے مالکوں کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں جیسے وہ ان کے قریبی عزیز ہوں۔ پیرس کے نہایت مہنگے ہوٹلوں میں یہ منظر اب عجیب نہیں رہا کہ ایک مرد یا عورت اپنے کتے کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں۔ " فرانسیسی لوگ اپنے کتوں سے کیوں اپنوں جیسا معاملہ کرتے ہیں " جمعیۃ رعایۃ الحیوان (پیرس) کے ایک مسئول سے جب یہ پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا: " وہ چاہتے ہیں کہ محبت کریں۔ مگر وہ انسانوں میں ایسے لوگ نہیں پاتے جن سے وہ محبت کر سکیں "۔

عورت مرد کے درمیان فطری توازن توڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے انسان منتشر ہو گئے۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، یہ سب انسان کی فطری ضرورتیں ہیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے لئے اس قسم کے افراد نہیں پا سکتے تو انھوں نے کتے سے محبت شروع کر دی۔ کیونکہ کتے میں کم از کم اتنی خصوصیت یقینی ہے کہ وہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا، کبھی بے وفائی نہیں کرتا۔

انسانی تجربات انسان کو سچائی کے دروازے تک پہنچا چکے ہیں۔ اب حاملین قرآن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اٹھیں اور سچائی کے بند دروازہ کو کھول دیں، تاکہ انسانی قافلہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں داخل ہو جائے جہاں ان کا رب ان کا انتظار کر رہا ہے۔

آخر میں ایک شبہ کا جواب دے کر اس گفتگو کو ختم کروں گا۔

طرابلس کے ندوۃ الحوار الاسلامی۔ المسیحی (فروری ۱۹۷۶) میں مسیحی موقف یہ تھا کہ دین صرف روحانی اقدار کا مجموعہ ہے۔ مسلم موقف یہ تھا کہ دین ایک مکمل نظام ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مسیحی نمائندہ (ڈاکٹر شو لیکل) نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ جدید زندگی کے بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں دینی کتابوں میں قوانین نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر سٹی پلاننگ۔ ایسی حالت میں دین کو مکمل نظام کے طور پر کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے شبہات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ قانون کے مختلف حصوں کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا۔ چنانچہ خلط مبحث کی وجہ سے معاملہ کی پوری نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ اسلامی نقطہ نظر سے قانون حیات کے تین مختلف حصے ہیں:

۱۔ شریعت

۲۔ فقہ

۳۔ تمدنی ضوابط

دین میں اساسی قانون کا جو حصہ ہے، اس کو شریعت کہتے ہیں۔ قرآن اور سنت ثابتہ اس شریعت کا ماخذ ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے زندگی کے وہ بنیادی قوانین بتا دیئے ہیں جن پر انسانی زندگی کا نظام صحیح طور پر قائم ہو سکتا ہے۔ یہ قوانین اسی طرح غیر متبدل ہیں جس طرح طبیعیات اور حیاتیات کے قوانین غیر متبدل ہیں۔

خدا سے تعلق بندوں کے ساتھ انصاف کی سب سے بڑی ضمانت ہے

فقہ، ایک معنی میں شریعت کے بنیادی قانون کی زمانی تعبیرات کا نام ہے۔ بنیادی انسانی قانون بلاشبہ ناقابل تغیر ہے۔ مگر زندگی کے نقشوں میں تبدیلی کی وجہ سے بار بار اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بدلے ہوئے نقشہ میں، اسلام کے ابدی قانون کو منطبق کیا جائے۔ فقہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ خلافت عباسی کے زمانہ میں جب اسلام کو وسعت حاصل ہوئی اور زندگی کے نقشے بدل گئے تو قاضی ابویوسف (۷۹۸ - ۷۳۱) سامنے آئے اور انھوں نے وقت کی عظیم ترین سلطنت کے تمام امور پر اسلامی قوانین کو منطبق کرکے دکھا دیا کہ اسلام کس طرح اپنے اندر گنجائش رکھتا ہے کہ ہر دور کی ضرورتیں پوری کر سکے۔

تاہم فقہ میں، اساسی شریعت کے برعکس، زمانی عنصر پایا جانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر فتاوی قاضی خاں میں ایک جزئیہ ہے کہ کوئی شخص قسم کھالے کہ میں ہوا میں اڑوں گا اور اڑ نہ سکے تو اس پر کفارہ واجب نہیں۔ کیونکہ ہوا میں اڑنا انسان کے لئے ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ کا فقیہہ اس قسم کا فتویٰ نہیں دے گا۔ فقہ کو ہر زمانہ کے حالات سے موافق بنانے کے اسی عمل کا نام اجتہاد ہے۔ شریعت، اجتہاد کے ذریعہ ثابت کرتی ہے کہ وہ کس طرح دائمی طور پر قابل عمل ہے۔ فقہی اجتہاد اگرچہ اساسی طور پر شریعت کا پابند ہے۔ مگر وہ کسی سابق فقہ کا پابند نہیں۔ کیوں کہ فقہ صرف اجتہاد اسلامی کا ریکارڈ ہے وہ بجائے خود شریعت نہیں۔

قانون کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کے لئے میں نے "تمدنی ضوابط" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں شریعت نے ہمیں کسی قانون کا پابند نہیں کیا ہے۔ بلکہ تمدنی ضرورتوں کے مطابق انسانی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ہر قسم کی ضابطہ بندی کی آزادی دی ہے۔ سورہ سبا کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کا ذکر کیا ہے جن کو بڑی بڑی مادی ترقیاں دی گئی تھیں۔ معدنیات کو تصرف میں لانے کا فن، ہوائی سفر کی قدرت، بعید مقامات تک خبر رسانی کی صلاحیت، فن تعمیر، انجینرنگ، زراعت، شہری پلاننگ وغیرہ میں ان کو غیر معمولی مقام حاصل تھا۔ مگر اس سلسلے میں کوئی "صنعتی شریعت" یا "تکنیکل فقہ" ان کو نہیں دی گئی۔ صرف یہ حکم دیا گیا کہ خدا کے شکر گزار رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمدنی امور میں ضوابط مقرر کرنے کا معاملہ شریعت سے متعلق نہیں ہے۔ یہ کام آدمی کو خود اپنے علوم (سائنس) کے ذریعہ انجام دینا ہے۔ البتہ اس کے اس عمل میں خدا کی شکر گزاری کی روح جاری و ساری رہنا چاہئے جو خود اس بات کی بھی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ اس کی قانون سازی ظلم اور فساد کے اجزاء سے پاک رہے گی ★★★

اس مقالہ کا عربی ترجمہ (وجوب تطبیق الشریعۃ فی کل زمان ومکان) الریاض کی اسلامی فقہ کانفرنس میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۶ کو ظفرالاسلام خاں نے نیابۃً پڑھا۔

مطالعۂ کتب

دنیا کی علمی اور ثقافتی تاریخ پر یونیسکو نے ایک کتاب چھاپی ہے۔ یہ کتاب چھ جلدوں میں ہے اور ہر جلد کے دو حصے ہیں۔ ترتیب میں دنیا بھر کے ڈیڑھ سو ماہرین سے مدد لی گئی ہے۔ ہمارے سامنے چھٹی جلد کے دوسرے حصہ کا عربی ترجمہ ہے جو ۲۰ ویں صدی کے "تطور المجتمعات" سے متعلق ہے۔

ہندوازم کے باب کے تحت مؤلف لکھتے ہیں۔

"ہندوازم کی اصلاح میں مغرب کا بڑا حصہ ہے۔ خود گیتا جو ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول ہوئی وہ اُن کے بڑے حصہ تک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ پہنچی تھی۔ گیتا کی تعلیمات پر پہلا مقدمہ جو مہاتما گاندھی نے لکھا وہ اس کے منظوم ترجمہ پر تھا جو سر اڈون ارنلڈ نے کیا تھا جس کا نام تھا THE SONG CELESTIAL (1885)۔ گیتا کا منثور ترجمہ جو اینی بسنٹ نے سانگ آف گاڈ کے نام سے کیا تھا، ایک نسل سے زیادہ تک وہ ہندوازم کے تمام طلبہ کا لازمی رفیق ہوتا تھا۔ اگرچہ تلک نے گیتا کی تشریح مراٹھی زبان میں لکھی تھی، اسی طرح گاندھی نے گیتا کی تشریح گجراتی زبان میں لکھی تھی، مگر وہ عام ہندوستانیوں تک انگریزی ترجمہ سے پہلے نہ پہنچ سکی۔ ہندوازم پر عہد جدید کی اکثر کتابیں انگریزی میں لکھی گئیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انگریزی زبان کا ہندوستان کے ہر علاقہ میں پھیلنا وہ چیز تھی جس نے ہندو اصلاحی تحریک کے قیام کو ممکن بنایا۔

عرصہ تک یہ صورت حال تھی کہ ہندوازم کی اہم کتابیں ان لوگوں کی دسترس سے باہر تھیں جو سنسکرت نہ جانتے ہوں۔ چنانچہ صرف تھوڑے سے لوگ جن کی اکثریت برہمن تھی ان کتابوں سے واقف تھے۔ وید اور اپنشد کے ترجمے ہندوستان کی مقامی زبانوں میں موجود نہ تھے۔ یہی حال ان بڑی بڑی شرحوں کا تھا جن پر ہندو فلسفہ کی بنیاد قائم ہے۔ میکس مولر کی الکتب المقدسۃ فی الشرق (۱۸۷۵) جو نویں صدی کے ربع آخر میں انگریزی میں شائع ہوئی اس نے ان نصوص کو تعلیم یافتہ ہندوؤں تک پہنچایا۔ اسی طرح ہندو فلسفہ کی شرح پر انگریزی کتابیں شائع ہوئیں مثلاً ویویکانند کی تقریریں، اروبندو کے مقالات اور اُن کی کتاب الحیاۃ المقدسۃ 1919 - 1916ء، رادھا کرشنن کی کتاب انڈین فلاسفی (۱۹۲۷) اسی طرح ہندوازم پر اکثر اہم کتابیں انگریزی میں لکھی گئیں اور ہندوستان کی سیاسی وحدت اور ایک زبان کا وجود میں آنا۔ اگرچہ وہ اجنبی تھی۔ اس نے اس کو ممکن بنایا کہ قومی تحریک ملک کے تمام گوشوں تک پہنچ سکے۔

یہ دو چیزیں ہندو احیار کے لئے لازمی تھیں (صفحہ ۳۳۸-۳۹)۔ گویا جو چیز اُن کے لئے ناموافق صورت حال (DISADVANTAGE) کی حیثیت رکھتی تھی اس کو انھوں نے موافق صورت حال :ADVANTAGE، میں تبدیل کرلیا ■

تاریخ البشریۃ

التطور العلمی والثقافی

المجلد السادس، الجزء الثانی

صفحات ۴۸۰، ۱۹۷۱ء

الهیئۃ المصریۃ العامۃ للتالیف والنشر، قاہرہ

"وہ مجھے مل گیا۔ مجھے مل گیا۔"

"خیریت! کیا مل گیا ہے تمھیں؟" میں نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"وہ! وہ آدمی! ہمارا آدمی۔ وہ جسے ہم تلاش کر رہے تھے۔ جلدی آؤ، میں نے اس کو ڈھونڈ لیا ہے۔" میری نے جواب دیا۔

اس روز میں سر درد کی وجہ سے باہر نہ جا سکا تھا اور صبح سے ہی کیمپ میں پڑا تھا لیکن اب میرا درد گویا جادو کے زور سے غائب ہو چکا تھا اور پھر ہم گاڑی میں بیٹھے کوہستانی گھاٹی کے تنگ راستے سے نیچے اُتر رہے تھے۔ ذرا دیر بعد ہم پتھروں کے ایک ڈھیر کے پاس گھٹنوں کے بل جُھکے میری کا خزانہ دیکھنے لگے۔

دانت ایک چٹان سے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ ہمارے خیال میں ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی دریافت سے وہ جستجو ختم ہونے کو تھی جس میں ہم نے ۲۸ برس بتا دیئے تھے۔ ٹانگانیکا کی دُور دراز گھاٹی اولڈوائی اس انسان کی باقیات سمیٹے ہوئی تھی جو اب تک سب سے قدیم تھے اور پیشتر ازیں اس کی ہڈیاں کبھی نہیں پائی گئیں۔ مارے خوشی کے ہماری چیخیں نکل گئیں۔ بالآخر ہماری تمام تر امیدیں، مشقتیں اور قربانیاں بار آور ہو گئی تھیں اور ہم نے اپنی دریافت کو کھودنا شروع کر دیا۔

چیزوں کی تلاش میں ہمارا طریقہ کار بڑا سیدھا سادہ ہے مگر ساتھ ہی بہت تکلیف دہ بھی۔ طریقہ یہ ہے کہ ہمیں گھاٹی کی ڈھلوانوں پر کبھی اوپر کی طرف اور کبھی نیچے کی جانب پیٹ کے بل رینگنا پڑتا ہے اس حال میں کہ ہماری آنکھیں زمین سے بمشکل چند انچ کے فاصلے پر ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں کوئی ننھا سا متحجر استخوانی ٹکڑا بھی نظر آ جائے فوراً رک جاتے ہیں اور کسی عمدہ برش یا دانتوں کے خلال سے بہت احتیاط کے ساتھ اس کی تفتیش کرتے ہیں اور یہ سب کچھ گرمی میں کرنا پڑتا ہے بعض اوقات گرمی ایک سو دس درجے فارن ہیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔

ہم ٹھان چکے تھے کہ اس کاسہ سر کا کوئی بھی اہم ٹکڑا ضائع نہ جانے دیں گے چنانچہ کئی ٹن سنگریزے اور مٹی چھان ڈالی اور انیس دن کی کاوشوں کے بعد قریباً پوری کھوپڑی ہاتھ آ گئی۔ نچلا جبڑا البتہ نہ پایا جا سکا اس نرم چٹان کے سکڑنے اور پھیلنے کے عمل کی وجہ سے یہ نئی دریافت شدہ کھوپڑی چار سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ڈاڑھوں اور رانیاب کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کھوپڑی جس انسان کی تھی وہ اٹھارہ سال کی عمر کا رہا ہوگا میں نے اسے زنجنتھروپس یا "مشرقی افریقہ کا آدمی" کا نام دیا ہے اس کے سپاٹ یا چپٹے کاسہ سر میں جو دماغ تھا وہ موجودہ انسانی مغز سے غالباً آدھا

.....چٹان میں دبی ہوئی ایک "کھوپری" ملتی ہے۔ پتھروں سے کاٹ کر نکالنے میں اس کے ریزے ریزے ہو جاتے ہیں۔ کئی ٹن سنگریزے اور مٹی کو چھاننے کے بعد جب "کھوپری" کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تلاش کرنے والوں کو کھوپری کا صرف ایک حصہ ملا ہے اور وہ بھی چار سو ٹکڑوں کی شکل میں۔

اسی قسم کی وہ "دریافتیں" ہیں جن سے علماء ارتقاء کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کروڑوں برس پہلے کچھ "انسان نما" حیوان بستے تھے جو موجودہ انسان کی ابتدائی کڑی تھے!

تھا۔ علاوہ ازیں کھوپڑی کے بالکل سامنے کٹاؤ دار ایک استخوانی اُبھار ہے جو دائیں سے بائیں کو چلا گیا ہے اس قسم کا اُبھار بعض انسان نما مخلوق میں پایا گیا ہے۔ موجودہ نسل انسانی ارتقاء کی جس منزل کو پہنچ چکی ہے کوئی کوئی شبہ نہیں کہ زنجنتھروپس اس سے کافی پیچھے تھا لیکن ہیں نے اس میں کم از کم بیس خصوصیات ایسی دیکھی ہیں جن کی وجہ سے وہ جنوبی افریقہ میں دریافت شدہ انسان نما مخلوق کی نسبت موجودہ انسان سے کہیں زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

"انسان" سے حقیقی مراد ہے کیا؟ میرے نزدیک انسان محض وہ قدیم بوزنہ نما مخلوق نہیں ہے جو سیدھی ہو کر چلتی تھی اور جس کے ہاتھ بھی تھے بلکہ صحیح معنوں میں انسان ہونے کے لئے ضروری تھا کہ وہ سوجھ بوجھ اور عقل بھی رکھتا ہو اور اپنے استعمال کے لئے بھدے سے اوزار گھڑ لینے کی صلاحیت بھی، اور آلات بنانے کی اہلیت ہی ایک ایسا نکتہ ہے جو اس بات سے قطعی جداگانہ ہے کہ صرف نوکدار لکڑیوں یا تیز نوکیلے پتھروں سے کام نکال لیا جائے جو قدرتی طور پر بنے بنائے دستیاب ہو سکتے تھے جس جگہ قدیم زنجنتھروپس اپنے بھدے گھر بنا کر رہتا تھا وہاں سے ہمیں اوزار بھی ملے اور یہ اوزار اس کھوپڑی کی دستیابی سے کئی سال قبل ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ ان میں کھالیں صاف کرنے اور جانوروں کی لاشیں کاٹنے کے بدوضع سنگی آلات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں قبر نما ایسے پتھر بھی ہیں جن سے ہڈیاں توڑ کر گودا نکالا جاتا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ زنجنتھروپس اپنے اوزار تراشنا جانتا تھا۔ آج تک جتنی بھی قدیم انسانی کھوپڑیاں پائی گئی ہیں۔ زنجنتھروپس کی

داڑھیں ان میں سب سے بڑی ہیں لیکن اس کے اگلے دانت نسبتاً چھوٹے اور کُند ہیں۔ چنانچہ اُن کی مدد سے زنجنتھروپس خرگوش یا اتنے ہی بڑے دوسرے جانوروں کی کھالیں اور سمور ہرگز ہرگز چیر پھاڑ نہیں سکتا تھا لیکن اس کے مسکن سے جو ہڈیاں ملی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جانور اس کی خوراک تھے ضرور۔ ان سب باتوں کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ زنجنتھروپس نے اپنی خوراک میں جب گوشت شامل کیا تو یقیناً اس نے اوزار بنانا شروع کر دیئے تھے۔ میں اولڈووائی پہلی بار ۱۹۳۱ء میں آیا تھا اور بیل گاڑی کو یہاں پہنچنے میں سات دن لگے تھے۔

راستے میں جنگلی جانوروں مثلاً ہاتھیوں، زیبروں، گینڈوں، زرافوں، ہرنوں اور چھوٹے خوشنما کوئی چودہ انچ اونچے بارہ سنگھوں کی کمی نہ تھی۔ اکثر جانور ہم سے شاذ ہی خوف کھاتے تھے۔ اس وقت جب ہم نے گھاٹی کے کنارے پڑاؤ ڈالا تو پہلی رات ہمارے نئے "ہمسائے" ہمیں دیکھنے آئے۔ رات کو کیمپ کے پاس میں نے کچھ ہلچل محسوس کی۔ یہ چلنے پھرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟ میں تحقیق کرنے باہر نکلا۔ اندھیرے میں مجھے سبز آنکھیں نظر آئیں۔ یہ گیارہ شیر تھے کچھ پاس اور کچھ ذرا پرے۔ اصل میں وہ اس حملے کی تفتیش کرنے آئے تھے جو ہم نے اُن کے علاقہ پر کیا تھا اور بلّی کے پورے خاندان میں شیر کو سب سے زیادہ متجسس طبیعت ملی ہے۔ ہمارے ان میزبانوں نے ہمیں کبھی نقصان نہ پہنچایا ان کی خوش اخلاقی کے جواب میں ہمارا رویہ بھی اُن کے ساتھ ہمیشہ شائستہ رہا۔

ایک روز میں نیروبی اپنے مکان پر تھا کہ اولڈووائی سے میری نے مجھے ریڈیو فون پر بتایا۔

"ہمیں ایک پاؤں ملا ہے۔ ہاں پاؤں کہہ رہی ہوں۔ شاید یہ بھی زنجنتھروپس کی طرح ایک اور ہیجان انگیز دریافت ہے۔"

"حیران کن خبر ہے، کیا کچھ پا چکی ہو؟"

"کافی حصہ، ایڑی اور ٹخنے کی ہڈیاں اور کچھ دوسری بھی، کب آ رہے ہو انھیں دیکھنے؟"

"بس آیا۔"

اور اس طرح مجھے دنیا بھر میں اب تک معدوم شدہ سب سے قدیم (HOMINID) کی متحجر ہڈیوں کا علم ہوا۔ یہ نوع اس "باقاعدہ خاندان" کا رکن تھی جس میں انسان اور انسان نما مخلوق شامل ہے۔ ہماری پارٹی کو اولین چیتے کے دانت تلاش کرتے کرتے بالکل صحیح حالت میں ایک دانت ملا، مگر یہ کسی چیتے کا نہ تھا۔

"بعونہٖ اولیٰ" میری چلائی۔

سطح سے نیچے خندق میں ہنسلی کی ایک ہڈی کھوپڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، انگلیوں کی ہڈیاں، پاؤں کی اہم ہڈیاں اور نچلے جبڑے کا بڑا حصہ ہاتھ لگا۔ اس جبڑے کے دانت بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ محفوظ تھے۔ یہ جگہ وہاں سے کوئی ڈھائی سو گز پرے تھی جہاں زنجنتھروپس ملا تھا مگر زنجنتھروپس کی جگہ اوپر تھی۔ اس کی نچلی پہلی داڑھیں گھسی ہوئی تھیں تیسری داڑھوں کی علامات تک سرے سے غائب تھیں گویا زنجنتھروپس سے پہلے کا یہ رکاز کسی گیارہ بارہ سالہ بچے کا ہے۔ سر کی ہڈیوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس بچے کی موت تشدد کا نتیجہ تھی۔ ضرب شدید لگنے کی وجہ سے ہڈی تڑخنے کے نشانات

موجود ہیں۔ وہاں چٹانیں بھی نہ تھیں کہ اُن پر سے
گر کر اتنا بڑا گھاؤ کھا کر مرا ہو۔ بہر حال وار کسی کند
ہتھیار سے کیا گیا تھا۔

تاحال ہمارے پاس اتنی معلومات نہیں
ہیں کہ زنجنتھروپس سے بھی زیادہ قدیم اس بچے کو ہم
(صحیح معنوں میں) انسان کہہ سکیں۔ میرا خیال ہے کہ
یہ زنجنتھروپس سے مختلف قسم کی نوع تھی، لیکن جہاں یہ
بچہ رہتا تھا وہاں سے ہمیں سادہ گھر، باقاعدہ گھڑے
ہوئے اوزار ملے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھوؤں، گربہ
ماہی اور نسبتاً بآسانی پکڑ لئے جانے والے آبی پرندوں
کی باقیات بھی دستیاب ہوئیں۔ گویا زنجنتھروپس سے
پہلے کی یہ مخلوق اچھی یا ماہر شکاری نہ تھی۔ البتہ وہ
سُست رفتار جانوروں اور پایاب پانیوں میں رہنے
والے پرندوں کو دوسرے جانوروں کے مقابلے میں
زیادہ آسانی کے ساتھ پکڑ بھی سکتے تھے اور مار بھی
سکتے تھے۔

زنجنتھروپس اور اس کے "پیشرو بچہ" کی قدامت
کے تعین پر ماہرین ابھی کام کر رہے ہیں۔ ویسے ہم دونوں
میاں بیوی صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ زنجنتھروپس چھ لاکھ
سال قبل رہتا تھا۔ گو ہمیں اس بات کا بھی پورا پورا
یقین ہے کہ وہ اس سے بھی کہیں زیادہ قدیم ثابت ہوگا
اور پھر مجھے زنجنتھروپس کی قدامت کے سلسلے میں کیلیفورنیا
یونیورسٹی کے جیالوجیکل ڈپارٹمنٹ کے ڈاکٹر گارنس
نے یہ اطلاع دی کہ:

"اولڈووائی کے رکازوں کے زمانے کی پوٹاشیم
ارگون پر تجربے ابھی جاری ہیں (تاہم) ابتدائی نتائج
بے حد چونکا دینے والے ہیں۔ زنجنتھروپس اور زنجنتھروپس
سے قبل کا طفل" بہت ہی قدیم ہے۔ میرے رفیق کار
ڈاکٹر جیک ایورنڈن اور ریس نے فی الحال ان نمونوں
کی قدامت ساڑھے سترہ لاکھ برس مقرر کی ہے۔ ہم
دونوں کو یقین ہے کہ یہ مدت اولڈووائی کی ابتدائی
آدمی کی صحیح قدامت کے قریب ہے۔

جب ہمیں کوئی اہم چیز مل جاتی ہے تو میرے
ساتھی مجھے یہ کہہ کر چڑھاتے ہیں

"اچھے نصیب ہیں"

اور اس بات کو میں بلا تامل مان لیا کرتا ہوں
کیونکہ قسمت اکثر یاوری کر جاتی ہے مگر ان کامرانیوں میں
اس حقیقت کو بھی تو پورا دخل ہے کہ میں ۲۵ برس سے
سخت محنت جستجو اور کھدائی میں لگا ہوا ہوں۔ میری
نے جزیرہ روسنگا (جھیل وکٹوریہ) میں اپنی ایک اور
عظیم دریافت کا سُراغ لگا لیا۔ لیکن اس سے پہلے ہم وہاں
سو سے زیادہ مقامات پر مقدر آزمائی کر چکے تھے۔ ایک
ڈھلوان کا بڑی توجہ سے معائنہ جاری تھا کہ اچانک میری کو
ایک دانت نظر آیا جو ایک خاکستری رکاز کا نقطہ یا دھبہ
سا لگ رہا تھا۔ چٹان کریدی تو ایک دانت اور برآمد
ہوا اور پھر کچھ اور بھی۔ کئی دنوں بعد جا کر ہم اپنا یہ گورکھ
یکجا کر سکے۔ یعنی وہ ہڈیاں جوڑیں یہ پروکونسل افریکنس
(PROCONSUL AFRICANUS) کی قریب قریب مکمل
کھوپڑی تھی اور یہ وہ مخلوق تھی جو ڈھائی کروڑ سال قبل
وہاں رہتی تھی۔ کئی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ایسی
مخلوق کو انسان اور بوزنے کی مشترکہ طور پر جد امجد ہونے
کا فخر حاصل ہے۔ پہلا موقع تھا کہ کسی محقق کو کسی اولین
میمون نما مخلوق کی کھوپڑی کا تقریباً مکمل نمونہ ملا تھا اور
انسانی ماضی کے مطالعہ کے لئے ایک نئی راہ سامنے آگئی ہے۔

یہ دریافت اس قدر اہم تھی کہ ہم نے اُسے فی الفور بذریعہ ہوائی جہاز لندن لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے نیروبی سے میری کو جہاز میں سوار کرایا۔ نازک کھوپڑی روئی کی تہوں میں لپٹی ایک صندوقچے میں رکھی تھی اور یہ صندوقچہ میری کی گود میں تھا۔ نیوز ریلوں کے فوٹو گرافر اور اخباری نمائندے لندن میں میری کی راہ تک رہے تھے۔ ہوائی اڈہ کی پریس کانفرنس کے موقعہ پر دو جاسوس کھوپڑی کی سخت نگرانی کا فریضہ انجام دینے میں مصروف تھے اور کسی وقت بھی انھوں نے پروکونسل افریکنس کے کاسۂ سر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ پروکونسل اور زنجنتھروپس برسہا برس کے شدائد اور سُست روی کا ثمر تھے۔

ہماری سب سے سنسنی خیز دریافت جبڑے کا وہ ایک حصّہ ہے جو فورٹ ٹرنن (کینیا) کے ہرے بھرے نشیبی علاقہ سے ملا۔ یہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سال پُرانا ہے۔ پروکونسل اور زنجنتھروپس کے مابین ارتقائے انسانی کے سلسلے میں ایک بڑی خلیج حائل ہے، اور یہ خلیج دو کروڑ برسوں تک پھیلی ہوئی ہے لیکن جس مخلوق کا یہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سال قدیم جبڑا ہے وہ اس خلیج کو پاٹ رہی ہے یا یوں سمجھئے کہ پُل کا کام دیتی ہے۔ ہم نے پروکونسل اور زنجنتھروپس کی اس درمیانی مخلوق کو کینیا پتھکس ورکری کا نام دیا ہے۔ کینیا پتھکس 'انسان' ہرگز ہرگز نہ تھا، لیکن انسان کی طرف ہماری رہنمائی ضرور کرتا ہے۔ اس کے اوپر والے جبڑے میں وہ گہراؤ یا نشیب موجود تھا جو ایک لازمی انسانی خصوصیت ہے۔ یہ جھکاؤ اوپری ہونٹ کی حرکت کو کنٹرول کرنے والے پٹھے کے لئے لنگر کا کام دیتا ہے۔ اور یہی پٹھا یا عضلہ ہے جو انسانوں کو بولنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ یعنی ایسی انسانی قوت گویائی جو خالی خولی آوازوں سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ پروکونسل کے انیاب (ڈاڑھوں) اور سامنے کے دانتوں کے درمیان والے دانت لمبے اور نوکیلے تھے۔ لیکن کینیا پتھکس کے انیاب چھوٹے بھی تھے اور انسانی دانتوں سے بہت مشابہ بھی۔ کینیا پتھکس اور انسان میں ان کے علاوہ اور مشترک خصوصیات کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن جب کینیا پتھکس کی ہڈیاں اور زیادہ مل جائیں گی تو اس مماثلت کے بارے میں مزید تفصیل سے بتایا جاسکے گا۔

"چلی انسان" کی دریافت اس قدر اہم اور چونکا دینے والی ہے کہ زنجنتھروپس اور اس کے پیشرو بچہ کی بازیافت سے کسی طرح کم نہیں۔ ۱۸۶۴ء میں دنیا کو پہلی بار پتہ چلا کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب دھرتی پر 'حجری دور کا تمدن' جاری وساری تھا۔ چار لاکھ سال قبل کے اس دور کو چلینن CHELLEAN کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ اس عہد کی اشیا سب سے پہلے فرانس کے ایک مقام چلس (CHELLES) سے ملی تھیں۔ 'چلی تمدن' کی خاص بات یہ ہے کہ اس وقت کے سنگی اوزار آسانی شناخت ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ایک اچنبھا یہ کہ گو افریقہ، ایشیا اور جنوب مغربی یورپ کے اکثر حصوں سے اس زمانے کی باقیات تو مل جاتی ہیں لیکن "چلی آدمی" کی کھوپڑی کسی کو بھی نہ ملی۔ قیام اولڈووائی کے ابتدائی ایام میں ہی میں نے "چلی آلات" برآمد کر لئے تھے۔ یہ ہمیں پرت نمبر ۲ سے ملے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ سطح بھی ہم نے برآمد کرلی جہاں 'چلی انسان' رہتا تھا لیکن ان لوگوں کی کوئی ایک بھی ایسی متحجر ہڈی دستیاب نہ ہوسکی جس سے پتہ چلتا کہ وہ کس طرح کے تھے؟

بعض اوقات میں سوچا کرتا ہوں کہ تقدیر ہمارے ساتھ دل لگی کرتی رہتی ہے کیونکہ جونہی ہم اپنے قبل تاریخ کے پُراسرار آدمی کی تلاش کرتے وہ نظر آجاتا۔ ایک روز میں اپنے شریک کار ماہر ارضیات رے پیرنگ کے ساتھ گھاٹی کا دورہ کر رہا تھا۔ پرت نمبر۲ میں مجھے ایک ایسی جگہ دکھائی دی جو اس سے پہلے کبھی نظروں میں نہ آئی تھی۔ اگلی صبح سویرے میرا سب سے چھوٹا بیٹا فلپ اور میں جھاڑیوں سے ہوتے اس مذکورہ مقام کو چل دئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"یہ جگہ کچھ ایسی ہے کہ یہاں سے ہمیں کھوپڑی ملے گی۔" ابھی الفاظ میرے منہ ہی میں تھے کہ میری نگاہ کچھ استخوانی ٹکڑوں پر جا پڑی جو ایک تنگ سی دراڑ میں پڑے تھے۔ میں وہیں گھٹنوں پر بیٹھ گیا۔ یہ کھوپڑی تھی انسانی کھوپڑی، جذبات کے مارے میرے منہ سے بات بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ آخر ہمیں وہ کچھ مل ہی گیا تھا جس کی کھوج میں ان گنت ماہرین انثریات ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے سرگرداں تھے۔ یہ "جلی انسان" تھا۔ خاصی تفصیل سے پتہ چل چکا ہے کہ کوئی چار لاکھ سال قبل "جلی انسان" کس طرح رہتا تھا۔

اولڈووائی اور فورٹ ٹرنن میں رکازوں کی بھرمار ہے۔ اولڈووائی میں انسانی ہڈیوں سے مشابہ ہڈیوں کا کوئی شمار نہیں۔ لیکن جانوروں کی ہڈیاں بھی ناپید نہیں، برسوں کی تلاش و جستجو کے دوران ہمیں گینڈے جتنے بڑے سور، مشرقی افریقہ کے سیاہ گینڈے سے تقریباً دگنی جسامت والے گینڈوں اور بھیڑوں کی متحجر ہڈیاں ملیں۔ کاندھے تک ان بھیڑوں کا قد ۶ فٹ تھا اور سینگوں کا دور بارہ فٹ، ۱۹۶۲ء میں ہم نے ایک ایسے بن مانس کی ہڈیاں بھی ڈھونڈ نکالیں جس سے بڑے اور قدیم بن مانس کی باقیات اب تک اور کہیں بھی نہیں ملی ہیں۔ ہماری عجیب ترین دریافتوں میں سے ایک کا نام "ڈائنو تھیریم" ہے۔ یہ انوکھی قسم کا مخصوص ہاتھی تھا جس کی سونڈ اس کے نچلے جبڑے میں لگی ہوئی تھی۔ اولڈووائی سے ہمیں دیو پیکر جانوروں کے متحجر ڈھانچے بھی ملے اور بہت ہی چھوٹے جانوروں کے بھی۔ ہم نے ہزاروں چھوٹے چھوٹے جانور اکٹھے کئے مثلاً چوہے، پرندے، کیڑے مکوڑے، کھانے والے چوہوں سے مشابہ جانور اور چھپکلیاں وغیرہ، ان میں سے کچھ تو اتنے ننھے منے ہیں کہ ان کے جبڑوں کی چھ ہڈیاں ایک ساتھ میرے انگوٹھے کے ناخن پر آسکتی ہیں۔

۱۹۶۱ء کی دو ماہ کی کھدائی کے دوران فورٹ ٹرنن سے ہمیں کوئی بارہ سو رکاز ملے۔ ان میں سے اکثر جانور سائنس کی دنیا کے لئے بالکل نئے ہیں۔ چھوٹے قد کا ایک زرافہ ہے جو قد و قامت میں بچھڑے جتنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ موجودہ زمانے کا براہ راست مورث اعلیٰ ہو۔

جزیرہ روسنگا رکازوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ پُراسرار ہے اور یہاں کی یہ پُراسراریت کیڑے مکوڑوں پھلوں اور پھولوں کے رکازوں میں مضمر ہے جو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ محفوظ ملے ہیں۔ کسی ہڈی یا سونڈ کے رکاز کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ یہ رکاز صحیح معنوں میں اصل ہڈی یا سونڈ ہی ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ رکاز بننے والی چیز کی شکل سر تا سر معدنیات میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن اصل صورت اور تمام تر جزئیات برقرار رہتی ہیں۔ متحجر ہونے کا عمل انتہائی سست ہوتا ہے۔

ہمیں روسنگا سے قدرت کے بہت سارے عجوبے ہاتھ آئے مثلاً تتلیوں اور پتنگوں کے پہلے روپ، مکھیاں

کائنات کی ارتقائی تعبیر کے لیے اُن کے جوش وخروش کا حال یہ ھے کہ چند ہڈیوں کی تلاش میں وہ پوری ایک صدی لگا دیتے ھیں

کیڑے کا ایک رُوپ، ایک بڑی چھپکلی کا سر جس کی زبان اب بھی اس کے منھ سے باہر نکلی ہوئی ہے اور ان سے بھی زیادہ عجیب یہ کہ پھولوں کی متحجر مکھیاں، گری دار میوے اور پھل بھی دستیاب ہوئے۔ ہم نے کچھ متحجر پھلوں کے اندرونی حصے دیکھنے کے لئے ہیرے تراشنے والے قلموں سے انھیں کاٹا۔ ان رکازی پھلوں کی تمام اندرونی جزئیات اور بیج بالکل محفوظ تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل کا کوئی تازہ سیب کاٹ دیا گیا ہو۔

۱۹۶۲ء میں اولڈووائی میں ایک اور معمّے سے سابقہ پڑا اور میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ جس سطح پر ہمیں زنجنتھروپس ملا تھا، اس سے کافی نیچے سب سے نچلی پرت پر پتھر کے بنے ہوئے بڑے بڑے گول حلقے دستیاب ہوئے۔ ان میں سے بعض تو درحقیقت ایک دوسرے کے اوپر ٹکے ہوئے تھے۔ بیس لاکھ سال پہلے یہ جگہ جھیل کا کنارہ تھی اور اس وقت اس قسم کے پتھر یہاں موجود نہ تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وہاں کیوں کر وجود میں آئے۔ ایسے کون سے عوامل تھے جنھوں نے یہ قطعی اور بالکل گول سنگین دائرے یا حلقے بنائے اور کس لئے بنائے؟ کیا انھیں گھر کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ہواؤں نے تراشے؟ ✪

ادب کی تحقیق

ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

ادبنی ربی فاحسن تادیبی

(میرے ربّ نے میری تربیت کی اور بہت اچھی تربیت کی)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کا لفظ قدیم عرب میں بھی مستعمل تھا۔ تاہم اس میں اختلاف ہے کہ ادب (بمعنی لٹریچر) کس لفظ سے نکلا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ اَدْبٌ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں دعوت کا بلاوا۔ تاہم فرانسیسی مستشرق پروفیسر نلینو کی رائے اس لفظ کے اشتقاق کے بارے میں دوسری ہے۔ وہ اس کو دَاْب (بمعنی عادت) سے مشتق مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ ادب، مفرد سے نہیں بلکہ دَاْب کی جمع سے نکلا ہے، دَاْب کی جمع اَدْآب ہے جو تبدیل ہو کر آداب ہو گئی ہے، جس طرح بئر اور رئم کی جمعیں اَبْآر اور اَرْآم سے بدل کر آبار اور آرام ہو گئی ہیں۔ اُن کے نزدیک دَاْب کی جمع آداب کا استعمال اس قدر عام ہو گیا کہ اہل عرب اس جمع کی اصل اور جو کچھ اس میں تبدیلی ہوئی ہے، اس کو بھول گئے۔ ان کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ آداب ایسی جمع ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور اس جمع سے انھوں نے اس کا واحد بجائے دَاْب کے ادب نکال لیا اور ادب کا عادت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد یہ لفظ اپنے اصلی معنی سے دوسرے مختلف معنوں میں منتقل ہوتا رہا۔

میں خدا کو مانتا ہوں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ میں نے زندگی میں جن بہترین انسانوں کا تجربہ کیا وہ سب خدا کو نہ ماننے والے لوگ تھے''

ڈاکٹر سید حسین ظہیر (۱۹۷۵ - ۱۹۰۰) ہندستان کے چوٹی کے سائنس داں تھے۔ ان کا شمار ڈاکٹر رمن، ڈاکٹر وکرم سارابائی، ڈاکٹر کھورانا، ڈاکٹر بھابھا، ڈاکٹر سینتھا جیسے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر بے شمار سائنسی تنظیموں کے ممبر یا عہدے دار تھے۔ ان کو پدم وبھوشن کا خطاب بھی ملا تھا۔ اپنے سیاسی ذوق کی وجہ سے جنگ آزادی کے زمانہ میں انھیں جیل جانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ذاتی طور پر وہ انتہائی شریف اور اعلیٰ کردار کے آدمی تھے۔ غریب طالب علموں کی فیس اپنی جیب سے دیا کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں ہندستان کی شمالی سرحد پر ایک پڑوسی ملک سے مسلح جھڑپوں کے بعد انھوں نے اپنے ایک رفیق ڈاکٹر امرجیت سنگھ کو تار دیا جو الیکٹرانکس کے ماہر تھے اور برٹش میں کام کر رہے تھے اس میں ولولہ انگیز الفاظ کے ساتھ کہا گیا تھا کہ ہندستان واپس آکر مادر وطن کی خدمت کریں، وہ واپس آگئے۔ ڈاکٹر ظہیر اس وقت کاؤنسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر سنگھ کو اس کے الیکٹرانکس کے شعبہ کا ڈائرکٹر بنا دیا۔ ان کے پالنی کے انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر ظہیر ایک بار گئے۔ ڈاکٹر سنگھ نے دوران ملاقات میں بتایا کہ ایک پروجکٹ کے سلسلہ میں بعض برآمدی مشینری اور آلات کی شدید ضرورت ہیں۔ رخصت ہوتے وقت ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا "اس کے لئے کتنا زرمبادلہ درکار ہوگا؟" انھوں نے تخمینہ بتایا۔ ڈاکٹر ظہیر نے حکومت پر زور ڈال کر وہ مشنری باہر سے منگوا دی۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ مہینہ کے دوسرے سنیچر کا دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا دفتر ضابطہ کے تحت بند تھا۔ مگر وہ خود حسب معمول دفتر میں آئے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان عورت، جس کے شوہر کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے ریسپشن ہال میں کیر ٹیکر سے درخواست کر رہی تھی اور وہ اُسے روک رہا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب کسی کام سے باہر نکلے۔ عورت تیزی سے ان کے سامنے آئی اور غصہ میں برا بھلا کہنا شروع کر دیا: "یہ کون سی حکومت ہے کہ میں ایک گھنٹہ سے یہاں بیٹھی ہوں اور آپ کے لوگ مجھے آپ سے ملنے نہیں دیتے۔" ڈاکٹر ظہیر نے اس کی باتوں کو سن کر نہایت نرمی سے کہا: آپ کو جو تکلیف پہنچی اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ اپنی شکایت تحریری طور پر مجھے دے دیں۔ میں آپ کا کام کرنے

کی پوری کوشش کروں گا۔"

۱۹۶۵ء میں وہ ایک سرکاری کام کے سلسلہ میں سری نگر گئے ہوئے تھے جس دن وہ دہلی لوٹنے والے تھے۔ موسم کی خرابی سے ان کے جہاز کی پرواز ملتوی ہوگئی۔ چونکہ دوسرے دن ان کو ایک ضروری میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ کار سے پٹھانکوٹ جائیں اور وہاں سے ٹرین کے ذریعہ دہلی کا سفر کریں۔ مگر وقت پر کار فراہم نہ ہوسکی، انھوں نے ٹیکسی سے اپنا سفر شروع کیا۔ ٹیکسی بھی راستے میں خراب ہوگئی۔ اب انھوں نے ایک جیپ لی۔ پٹھانکوٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ٹرین میں جگہ نہیں مل سکتی۔ اب وہ جیپ ہی کے ذریعہ دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ ڈرائیور تھکا ہوا تھا، اونگھنے لگا، ڈاکٹر صاحب نے اس کو مجبور کیا کہ وہ پچھلی سیٹ پر آرام کرے اور خود جیپ چلانے لگے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر ۶۰ سال کا یہ انسان ساری رات جیپ چلاتا رہا۔ صبح کو وہ ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر کے ٹرین سے پہلے دہلی پہنچ چکا تھا۔

اس قسم کی بے شمار خوبیوں کے باوجود ڈاکٹر ظہیر خدا اور مذہب کے قائل نہ تھے۔ ایک بار اُن کے ایک رفیق کار نے اپنے دادا کے انتقال کے بعد کچھ رسوم ادا کرنے کے لئے چھٹی کی درخواست دی تو انھوں نے یہ لکھ کر واپس کر دی "مجھے کامل یقین ہے کہ اگر روح کوئی چیز ہے تو آپکے دادا کی روح آپ کے سائنسی کام کو دیکھ کر زیادہ خوش ہوگی۔ بجائے اس کے کہ آپ اس کے لئے کوئی رسم ادا کریں۔"

۲۲ دسمبر کو انتقال سے کچھ پہلے ڈاکٹر ظہیر کو زکام ہوگیا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین (لکھنؤ) کے نام ایک خط میں کیا۔ مکتوب الیہ نے اپنے جواب میں دعائیہ کلمات کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ "خدا کی ذات بالاتر ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے" ڈاکٹر ظہیر نے دوبارہ اپنے جواب میں لکھا:

Since I do not believe in God, I do not believe in his supermacy also. It is only the good work done by good human beings which became supreme over the bad work done by the bad human beings.

چونکہ میں خدا پر یقین نہیں رکھتا، میں اس کی بالاتری کا بھی قائل نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اچھے آدمیوں کا کیا ہوا اچھا عمل ہی سب سے بڑی چیز ہے جو بُرے آدمیوں کے بُرے عمل پر فوقیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین نے جواب میں جو خط لکھا اس میں یہ جملہ بھی تھا:

I do confess that in my experience of last 20 years, the best human beings I have found are those who do not believe in God.

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے ۲۰ سال کے تجربہ میں بہترین انسان وہی لوگ تھے جو خدا کو نہیں مانتے تھے

> اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کل اُن کا کیا انجام ہونے والا ہے تو ان کا آج اُن کے لئے بے لذت ہو جائے۔ یہ آنے والے کل سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کے آج کو ان کے لئے لذیذ بنا رکھا ہے۔

دلّی سے تقریباً سو میل کے فاصلہ پر "زمیندارون" کا ایک قصبہ ہے۔ پچھلے دنوں یہاں چند بار جانے کا اتفاق ہوا:

۱۔ مئی ۱۹۷۳

۲۔ جولائی ۱۹۷۳

۳۔ جولائی ۱۹۷۵

یوپی کے اس قصبہ میں کبھی مسلمانوں کا بڑا جاہ و جلال تھا۔ مگر زمینداری کے خاتمہ کے بعد اب دنیا بدل چکی ہے۔ قدیم وضع کی چوپالوں میں اب بھی یہاں قہقہے گونجتے ہیں۔ اگرچہ یہ چوپالیں اب زیادہ تر وقت گزاری کی بیٹھک ہو کر رہ گئی ہیں۔ جب کہ زمینداری کے زمانہ میں وہ اس علاقہ کے اقتدار کا مرکز تھیں۔ یہاں ایک درجن مسجدیں ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ کئی سو سال کے اقتدار کے باوجود یہاں کے لوگوں نے بستی میں کوئی درس گاہ قائم نہیں کی اور نہ کوئی بڑی جامع مسجد بنائی۔ نہ صرف نماز جمعہ بلکہ عید کی نماز بھی اس چھوٹے سے قصبہ میں ایک سے زیادہ مقام پر ہوتی ہے۔

یہ قصبہ ایک ٹاؤن ایریا ہے۔ یہاں ایک ہائی اسکول ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا تھا۔ طلبہ کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہے۔

"اس اسکول میں مسلمان طالب علم کتنے ہوں گے۔" میں نے اسکول کے ایک استاد سے پوچھا۔

"تقریباً پچاس" انھوں نے جواب دیا۔

"یعنی پچاس فی صد" میں نے دوبارہ سوال کیا۔

"نہیں صرف پچاس"

گویا قصبہ کے مسلمان جو یہاں کی دس ہزار آبادی میں نصف کے حصہ دار ہیں، تعلیم میں ان کا حصہ دس فی صد سے زیادہ نہیں۔ اگر آپ بازار میں نکلیں اور تجارتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا اندازہ لگائیں تو وہ اتنا کم ہوگا کہ حسابی غلطی کے الزام سے بچنے کیلئے ہی ان کو صفر سے زیادہ کہا جا سکتا ہے۔

محرومیوں کی اس فہرست میں صرف یہاں کی زرخیز زمینیں مستثنیٰ ہیں جن کے بڑے حصے پر اب بھی مسلمان قابض ہیں۔ لیکن اگر اس تلخ حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ بیشتر نے اپنی زمینیں جنس یا بٹائی پر دے رکھی ہیں تو یہ اندیشہ بہت زیادہ بعید از قیاس نہیں کہ مستقبل میں زمینوں کے ساتھ بھی وہی قصہ پیش نہ آجائے جو اپنی غفلت سے بقیہ چیزوں میں پیش آچکا ہے۔

"آپ اپنی زمینوں پر خود کھیتی کیوں نہیں کرتے"، اگر آپ ان میں سے کسی سے سوال کریں تو وہ جواب دے گا کہ ہم کو جنس یا بٹائی پر دینے میں جو فائدہ ہے، وہ خود کھیتی کرنے میں نہیں ہو سکتا"۔ یہ جواب بظاہر صحیح ہے۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود شاید ہی ان میں سے کوئی شخص یہ ماننے کے لئے تیار ہو کہ موجودہ نظم جہاں ان کو یہ فائدہ دیتا ہے وہیں وہ ایک بہت بڑی چیز ان سے چھین رہا ہے، اور وہ جدوجہد کا حوصلہ ہے۔ موجودہ انتظام کے تحت ایک باپ اپنی اگلی نسل کو تن آسانیوں کی وراثت دے رہا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انھیں مشقت اور جدوجہد کی وراثت دیتا تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر تھا۔ تاہم ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔ سایہ کے نیچے مونڈھوں پر بیٹھ کر وقت گزارنے کے بجائے وہ ٹریکٹر کی سیٹ پر زندگی کا امتحان دینے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ اپنے لئے جگہ بناتے ہیں جو وقت کے حقائق کا سامنا کرنے اور ان کے مقابلے میں زندگی کا ثبوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ تن آسانیوں نے کبھی کسی قوم کے لئے زندگی کا حق تسلیم نہیں کیا ہے۔

کوئی معقول بات آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک اپنی نامعقولیت کی قیمت ادا کرنے کے لئے اس کی جیب میں پیسے موجود ہوں۔

اور یقیناً یہ قصبہ اس عام قانون سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

دوسری مسلم بستیوں کی طرح یہاں بھی آپس کا اختلاف مسلمانوں کی قوت کو کمزور کر رہا ہے۔ نئے انقلاب نے مسلمانوں سے بہت سی چیزیں چھین لی ہیں۔ تاہم ایک چیز اب بھی پوری طرح موجود ہے اور وہ خود ان کا اپنا وجود ہے۔ اس وجود کو متحدہ شکل میں باقی رکھنا ہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ مگر جو لوگ آپس میں لڑ رہے ہوں، وہ کچھ ایسے نشے میں ہوتے ہیں کہ کسی طرح بھی اس حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ سب سے زیادہ اندوہناک بات یہ ہے کہ لڑائی نہ کرنے کی بات کسی کی سمجھ میں اس وقت تک آتی ہی نہیں جب تک اس کے پاس لڑائی کی قیمت ادا کرنے کے لئے پیسے موجود ہوں۔ حالاں کہ اسی پیسے کو اگر وہ اپنی تعمیر و ترقی میں لگائے تو خود فریق مخالف کو مغلوب کرنے کے لئے بھی اس سے زیادہ کارگر کوئی حربہ نہیں۔ بہترین صلاحیتیں بے سود مقابلوں میں ضائع ہو رہی ہیں۔ حالاں کہ وہ تجارت یا اور کوئی تعمیری کام کر کے زیادہ بڑے پیمانہ پر اپنے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

قصبہ میں کوئی قابل ذکر اسلامی مدرسہ نہیں۔ یہاں مسلمانوں کے پاس بڑی بڑی زمینداریاں تھیں۔ وہ کئی سو برس تک اس تاریخی قصبہ کے اقتدار پر چھائے رہے۔ انھوں نے اپنی عظمت کے نشان کے لئے عالی شان حویلیاں اور چوپالیں بنائیں۔ مگر اپنے دین کی حفاظت و فروغ کے لئے وہ کوئی دینی درس گاہ اپنی بستی میں قائم نہ کر سکے۔

دینی درس کا لفظ موجودہ زمانہ میں کچھ بدنام سا ہو گیا ہے۔ حالاں کہ یہ دینی درس گاہیں ہر دور میں مسلمانوں کا دینی اور تہذیبی مرکز رہی ہیں۔ دور نبوت میں "صفہ" اسی قسم کی ایک درس گاہ تھی جس سے وہ لوگ تربیت پا کر نکلے جنھوں نے سارے عالم میں علوم نبوت کی اشاعت کی۔ پھر یہی دینی درس گاہیں ہیں جہاں اسلامی دور حکومت کے وزراء و قضاۃ تیار ہوتے تھے۔ یہی دینی درس گاہیں ہیں جنھوں نے وہ علماء و مصنفین پیدا کئے جنھوں نے ہر دور میں اسلام کی فکری اور علمی نمائندگی کی۔

مئی ۱۹۷۳ میں قصبہ کے لوگوں نے باہم مشورہ سے ایک مدرسہ کا قیام منظور کیا تھا۔ جولائی ۱۹۷۵ میں دوبارہ ایک اجتماع میں طے کیا گیا کہ مقامی مکتب کو ترقی دے کر ایک بڑا دینی مدرسہ بنایا جائے۔ اس کے وسائل کی فراہمی کے لئے بھی مختلف لوگوں نے فیاضانہ پیش کشیں کیں۔

۱۳ جولائی کی ایک نشست میں، جس میں بستی کے اکثر ممتاز افراد شریک تھے۔ مدرسہ کے لئے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ ہر شخص کے پاس جتنے کھیت یا باغ ہیں۔ ایک روپیہ فی بیگھہ سالانہ کی شرح سے وہ مدرسہ کی امداد کرے گا۔

اس قسم کا فیصلہ کسی بستی میں ایک معیاری درس گاہ کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہے۔ مگر آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے اگر میں آپ کو یہ خبر دوں کہ یہ فیصلہ اس عام انسانی کمزوری سے مستثنیٰ نہ رہ سکا جس کو کسی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

لوگوں میں طاقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادہ کی *

تعارف وتبصرہ:

حلیۃ النبی

از مولانا سید احمد قادری

صفحات ۸۰ ۔ قیمت ایک روپیہ

پتہ: مکتبہ الحسنات رام پور ۔ یوپی

یہ کتاب، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ وسراپا سے متعلق ہے۔ کتاب کافی جامع ہے اور احادیث وسیر کی مستند کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔

تاہم بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذاتی مصنف نے غالباً حلیہ پاک اور نعت نبوی میں فرق نہیں کیا۔ مثال کے طور پر "خوشبوئے بدن" کے عنوان کے تحت یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

ولو ان رکبا یمموہ لقادھم
نسیم شذاہ واستدل بہ الرکب

اگر سواروں کی کوئی جماعت آپ کا قصد کرتی تو آپ کی نسیم عطر زا اس کی رہبری کرتی اور وہ جماعت آپ کا پتہ لگا لیتی (۴۷) یا مثلاً یہ کہ "جب آپ دراز قامت اشخاص کے ساتھ چلتے تو ان سے اونچے ہو جاتے اور جب ان سے الگ ہوتے تو آپ کے قد کا اعتدال لوٹ آتا۔ یہ اس لئے کہ کوئی نفس صورۃً بھی آپ سے نہ بڑھے، جیسا کہ معنیً نہیں بڑھ سکتا تھا (۵۹-۵۸) اس قسم کے اقتباسات نظم ونثر میں نعت ہیں نہ کہ حلیہ رسول۔

بعض مقامات پر ادبی فروگذاشت نظر آتی ہے مثلاً آپ کی نعت میں ابوطالب کی طرف یہ شعر منسوب کیا جاتا ہے:

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ

اس کا ترجمہ کتاب میں ان الفاظ میں درج ہے: "بدلیاں آپ کے چہرے کے طفیل میں پانی برساتی تھیں"۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "آپ کے چہرے کے وسیلے سے بارش کی دعا کی جائے"۔

کتاب کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے: "شیفتگان حسن وجمال جس طرح شمع رخ کے پروانے ہوتے ہیں اسی طرح سنبل زلف کے دیوانے بھی، وہ نرگس چشم کے بھی بیمار ہیں، اور سرو قامت کے وارفتہ بھی۔ وہ حسن کی ہر ادا پر جان چھڑکتے ہیں" اسی طرح دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: "آپ نہ صرف یہ کہ مجموعی حیثیت سے حسن وجمال کے بے مثال پیکر تھے بلکہ ہر ہر عضو حسن کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا جس کی کہیں نظیر نہیں۔ آفتاب آپ کے چہرے پر قربان، ماہتاب آپ کی پیشانی پر صدقے، ہلال تو آپ کے ابرو کا فدائی، نرگس آپ کی آنکھوں کی بیمار، سنبل آپ کے گیسو کی آشفتہ، سرو آپ کی قامت کا شیفتہ، در شہوار آپ کے دانتوں پر نثار، غرض کائنات کی ہر حسین شئے آپ کے جمال پر قربان تھی۔ آپ کائنات کی وجہ تخلیق، اس کی جان اور اس کی روح تھے اس لئے آپ کی محبوبیت نہ صرف جانداروں پر اثر انداز تھی، بلکہ شجر وحجر سب آپ کی محبت میں گرفتار تھے۔

ہیچوں تو نازنینی ز تا بپا لطافت
گیتی نشاں ندادہ ایزد نیا فریدہ"

کتاب کے اسی اسلوب کی بنا پر اس کے دیباچہ نگار مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے: "اس رسالہ کے مصنف ماشاء اللہ عالم بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، اس لئے شعر وادب کی زبان حسن وعشق میں انھوں نے اہل شوق کے لئے حلیہ مبارکہ کی ایک ایک چیز کو پوری تفصیل کے

ساتھ بیان فرمایا ہے"۔

قدیم زمانہ ادب و شاعری کا زمانہ تھا۔ اس لئے سیرت و شمائل کی کتابوں کے لئے یہ اسلوب پسند کیا جاتا تھا۔ اب تاریخی ذوق کا زمانہ ہے۔ جدید انسان کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کی بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کا ہر پہلو معلوم و منضبط ہے۔ آپ ہر اعتبار سے ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ آج کے انسان کے لئے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہوگا کہ ادب و شاعری کے بجائے تاریخ کی زبان میں سیرت و شمائل کی کتابیں لکھی جائیں۔ نیز پیغمبر کی شان کے قریب تر بات بھی یہی ہے کہ آپ کی شکل و شباہت کو تاریخی شخصیت کے حلیہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے نہ کہ "محبوب کے سراپا" کی حیثیت سے۔

فاضل مصنف نے یہ کتاب ۴۶-۱۹۴۵ میں لکھی تھی جب کہ وہ ایک نوجوان ادیب تھے۔ اب پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد غالباً وہ خود بھی "چشم شہلا" اور "گیسوئے پرخم" کی زبان اس موضوع کے لئے پسند نہیں فرمائیں گے ☐

سوال و جواب

ایک صاحب قاہرہ سے لکھتے ہیں:

"آپ کی کتاب جو یہاں حکمۃ الدین کے نام سے شائع ہوئی ہے اس پر ایک جدال پیدا ہوگیا ہے۔ کچھ لوگ اس کے سخت موید ہیں اور کچھ لوگ سخت مخالف۔ قاہرہ یونیورسٹی کے طلبا کے درمیان اس کتاب کے بارے میں سمینار بھی ہوچکا ہے۔ مخالف گروپ کا کہنا ہے کہ آپ نے جہاد ہی کو ختم کر دیا ہے اور دین کو صوم و صلوٰۃ میں محدود کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں کے جرائد میں بعض تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں"

جواب

جہاد بلاشبہ اسلام میں افضل ترین عبادت ہے۔ مگر جہاد کو قتال کے معنی میں لینا اتنا ہی غلط ہے جتنا اس کو دین کی فہرست سے خارج کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ امت محمدی کا جہاد، دعوت ہے۔ قرآن میں شہادت حق کی راہ میں قوت صرف کرنے کو جہاد کہا گیا ہے (حج۔ آخر) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کے ذریعہ لوگوں کے اوپر تبلیغی جہاد کرو (فرقان۔ ۵۲) قرآن میں دعوت کا حکم آیا تو خود اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک بھاری حکم (مزمل۔ ۵) قرار دیا۔ دعوت و تبلیغ کو اتنا بڑا کام بتایا گیا کہ اس میں پوری طرح لگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہلکان کرلے (لعلک باخع نفسک) موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تحریکوں سے جو غلطیاں ہوئیں ان میں یہ غلطی سرفہرست ہے کہ انھوں نے جہاد کا مطلب قتال یا سیاسی معرکہ آرائی سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد کا میدان، دعوت کے بجائے سیاست بن گیا اور مومنانہ سرفروشی کے جذبہ کی تسکین کے لئے اس دنیا میں صرف دو کام باقی رہ گئے ــــ اگر موقع ہو تو تلوار زنی ورنہ تقریر بازی۔ مصر، الجزائر اور ہندستان اس کی نمایاں مثال ہیں۔ ان علاقوں میں جب "استعمار" یا "باطل اقتدار" کے خلاف جنگ و پیکار کے مواقع تھے تو لاکھوں مجاہدین اپنے جان و مال کی قربانی دیتے رہے، اور جب اس کا موقع ختم ہوگیا تو اب انھیں اس کے سوا کوئی کام نظر نہیں آتا کہ مفروضہ طاغوتی سیاست کے خلاف تحریر و تقریر کے لفظی طوفان برپا کرتے رہیں، اور جب اس کا موقع بھی باقی نہ رہے تو گوشہ گیر ہو کر "ختم خواجگان" کے ورد شروع کر دیں!

جہاد ہی وہ طاقت ہے جس سے اسلام اس زمین پر قیام و استحکام حاصل کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر جذبہ جہاد کے استعمال کے باوجود اسلام کو اس دور میں قیام و استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا جذبہ اپنے نکاس کا صحیح راستہ نہ پا سکا اور غلط سمت میں بہہ کر ضائع ہوگیا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک بڑے دریا کا پانی بے پناہ مقدار میں بہہ کر سمندر میں جا گرے اور اس کے ساحل کے دونوں طرف کھیتیاں پانی نہ ملنے کے باعث سوکھ کر ختم ہو رہی ہوں۔ صرف اس لئے کہ دریا کے پانی کو ان کھیتوں کی طرف موڑنے کا انتظام نہ ہو سکا تھا۔

دعوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے کان میں کچھ الفاظ ڈال دیئے جائیں یا ان کی غلط روش پر تنقید کر دی جائے ــــ حقیقت یہ ہے کہ دعوت ایک انتہائی قربانی کا عمل ہے۔ اپنا وقت، اپنے جذبات، اپنا مال، غرض اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے بعد وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو دعوت کہتے ہیں۔ قرآن میں حکم ہے کہ مدعو کے لئے داعی کے دل میں انتہائی خیر خواہی ہو، جو بات کہی جائے وہ قول بلیغ کی زبان میں اور مخاطب کی

اپنی قابل فہم اصطلاحوں میں ہو، مدعو کی طرف سے ہر قسم کی ایذا پر مکمل صبر کیا جائے۔ مدعو کی طرف سے کسی اجر کی توقع نہ رکھتے ہوئے اپنا مال اور اثاثہ اس راہ میں خرچ کیا جائے۔ مدعو کی طرف سے اعراض پر جھنجلانے کے بجائے اس کی ہدایت کے لئے دعائیں کی جائیں، ہر ممکن طریقے سے مدعو کی تالیف قلب کی جائے۔ دعوتی کام کو مسلسل تا عمر جاری رکھا جائے۔ سو ایسا ایک عمل اگر اس کے پورے آداب کے ساتھ شروع کیا جائے اور اس کا مکمل حق ادا کیا جائے تو یہ اتنا بڑا اور اتنا نفس کش عمل ہے کہ بڑے سے بڑے انسان کی شخصیت اس کی ذمہ داریوں سے بلبلا اٹھے اور کبھی اس کی ادائگی کی طرف سے اپنے کو سبکدوش نہ سمجھے۔

اس دعوتی عمل کے ظہور کے لئے قدیم زمانہ میں جو طریقے رائج تھے، اب ان میں بے شمار نئے طریقوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں دعوتی کام نے بھی، تدابیر اور ذرائع کے اعتبار سے، نئی وسعت اختیار کر لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کا جہاد آج اتنا وسیع الاطراف ہو چکا ہے کہ "پٹرو ڈالر" کی مہیب دولت بھی اس کا حقیقی بل ادا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس زمانی فرق کو دیگر مذاہب، مثال کے طور پر عیسائیت نے خوب سمجھا اور اس کو بھرپور طور پر اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے استعمال کیا۔ مگر مسلمان اس میدان میں اس قدر پیچھے ہیں کہ جدید امکانات کا انھیں شعور تک نہیں۔ حتیٰ کہ دعوتی کام ان کو اتنا معمولی نظر آتا ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے پھسپھسے کام کو جہاد کس طرح کہا جا سکتا ہے!

ماہنامہ علمی انتخاب ڈائجسٹ

یہ اپنی نوعیت کا وہ واحد علمی، ادبی، مذہبی اور اصلاحی ڈائجسٹ
ہے جس نے ایک قلیل عرصے میں اپنا ایک خاص مقام
پیدا کر لیا ہے۔ اور جس کی شہرت اب ہندستان کی
سرحد سے گزر کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی ہے
اس ڈائجسٹ میں آپ کو معیاری مضامین۔ بلند پایہ افسانے
سچی کہانیاں۔ آپ بیتی اور شعر و نغمہ کے مطالعے کا ایک ساتھ
موقع ملے گا۔ آفسٹ کی خوبصورت طباعت۔ سہ رنگا سرورق۔

فی شمارہ: دو روپے ۵۰ پیسے۔

سالانہ خریداری۔ ۲۸ روپے۔ بذریعہ رجسٹری ۵۸ روپے

علمی انتخاب ڈائجسٹ

۳۔ عبد العلی روڈ۔ کلکتہ ۱۶

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
FEBRUARY 1977

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

الاســلام

از : مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ —— قیمت مجلد ۱۵ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ
اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب :
جدید مسئلہ کیا ہے
حقیقت دین
ارکان اربعہ (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ)
صراط مستقیم
اسوۂ نبوت
تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
تعمیر ملت
دعوت الی اللہ
دعوت اسلامی کے جدید امکانات

رسالہ بک ڈپو ـ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی ۶

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر "دفتر الرسالہ" ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا